چاند کا سلام
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
اسعد گیلانی
اسلم کمال

چاند کا سلام

اسعد گیلانی کی تصنیف

تحریکِ مجاہدین کا انقلابی پہلو	۳،۰۰
مولانا مودودی سے ملئے	۶،۵۰
تلاشِ راہِ حق	۲،۰۰
مسلمان کے شب و روز	۳،۲۵
تصویریں	۳،۲۵
پُکار	۱،۵۰
انتظار	۱،۰۰
آدم کے تین بیٹے	۱،۷۵
حکایاتِ جنوں	۲،۰۰
قافلۂ سخت جاں	۶،۰۰
ذراتِ درخشاں	۱،۰۰
کتابِ انقلاب	۱،۰۰
سوانح چوہدری علی احمد خاںؒ	۶،۰۰
ساتھی کے نام	۳،۰۰
جب ملت بیدار ہوئی	۲،۵۰

ادارۂ ادب اسلامی سرگودھا

اسعد گیلانی کے

منتخب مضامین

چاند کا سلام

مرتبین

فروغ احمد ایم اے
آباد شاہ پوری ایم اے
غلام حسین اظہر ایم اے
رفیع الدین ہاشمی ایم اے

اشاعت اول: ایک ہزار
قیمت ۴ روپے

کتابت: تمکین رقم

ہماری مطبوعات

مکتبہ آئین، ۱۲ نسیم مارکیٹ۔ ریلوے روڈ لاہور
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مکتبہ جماعت اسلامی، ہند دہلی ۶
مکتبہ چراغ راہ۔ یوسف منزل، کراچی
سے بھی مل سکتی ہیں

ترتیب

دیباچہ

انہیں دنوں اسعد گیلانی صاحب کے تحریکی ادب پاروں کے پانچ مجموعے میری نظر سے گذرے ہیں۔ یہ خصوصی مطالعہ میں نے ان کے تحریکی تصورِ ادب کا جائزہ لینے کے لئے کیا ہے۔ اسعد صاحب تحریکِ اسلامی کے ایک منفرد ادیب ان معنوں میں ہیں کہ انہوں نے دو حیثیتوں سے اسلامی ادب کی تخلیق کا کام کیا ہے۔ اوّلاً تحریکِ اسلامی کے ایک حق گو اور بے باک سپاہی کی حیثیت سے (یہ ان کی اصل حیثیت ہے) اور ثانیاً ایک ایسی ادبی تحریک کے ممتاز علمبردار کی حیثیت سے جس کا اپنا ایک ادبی منشور ہے۔ اسعد صاحب کی ان دونوں حیثیتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ بہرحال ایک انشاء پرداز ہیں وہ فن کار ہیں لیکن ان کا انداز راست ہے۔ ان کی تمثیلات (ALLEGORIES) کے حریری لبادے بھی ڈھاکہ کی روائتی ململ سے مشابہ ہیں۔ ان کے فن پارے بدنِ آدم کے تزئین ہیں،

نامی مجموعہ کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ ان کا فن صحیح معنوں میں باآوازِ بلند سوچنے (THINKING ALOUD) کا فن ہے۔ وہ گوریلا طریقۂ جنگ سے مزاجاً کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ وہ بالکل چھپا کر کچھ دینے کے قائل ہی نہیں اور بہت زیادہ تکلفات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ ع

کیا ہے شعر کو پردہ سخن کا

تو اسعد صاحب ایسا پردہ استعمال نہیں کرتے کہ نگاہیں اس کے پُر اسرار نقش و نگار ہی میں اُلجھ کر رہ جائیں۔ تفکر، خطابت اور انشاء پردازی کے تال میل سے جو کیفیت طاری ہوتی ہے بس وہی ان کے قارئین کو اپنی طرف مائل کرنے اور مائل رکھنے کے لئے کافی ہے۔ وہ "رُوئے زیبا" ہیں او پر سے میک اپ کے ذریعہ "آب و رنگ و خال و خط" پیدا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی عام ادبی نگارشات ہوں یا ان کے وہ رشحاتِ قلم جنہیں وہ "تحریکی ادب" کے ذیل میں شمار کرتے ہیں، انشائی کیفیت (DICTION) کے اعتبار سے باہم کچھ زیادہ متغائر یا مختلف نہیں۔ حریری پردوں میں سلوٹیں اگر زیادہ ہوئیں اور دیکھنے والی آنکھوں کو زاویے کچھ زیادہ بدلنے پڑے تو بات دوسری ہے ورنہ انداز جتنا زیادہ راست ہوگا۔ خود ان کے نزدیک ان کا مضمون اتنا ہی زیادہ تحریکی قرار پائے گا۔ یہ بات میں یونہی محض اپنے تاثر کی بناء پر نہیں لکھ رہا ہوں۔ یہ موقف "نئے زاویے" کے دیباچے سے ظاہر ہے جہاں انہوں نے تحریکی مضامین میں ایک آدھ تمثیلی مضمون کو بھی شامل کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان کا خول بہت باریک ہے۔ مجھے ایک خط میں انہوں نے تحریکی ادب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میں یہی سمجھا ہوں کہ تحریکی ادب وہ ادب ہے جو برائے تحریک ہو۔ یعنی "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے حیات" کی طرح

"ادب برائے تحریک"۔ لیکن ماننا پڑے گا کہ "ادب برائے تحریک" ادب برائے حیات ہی کا ایک ضمیمہ ہے ۔ اس کی تشریح آگے آئے گی۔

یہ بات چنداں صراحت طلب نہیں ہے کہ تحریکی ادب لازماً کسی ادبی تحریک کی پیداوار نہیں ہوتا۔ لیکن کارواں کے ساتھ رحیلِ کارواں کے لئے درا و جرس اور ترانہ و حُدی کا تصور ایک فطری امر ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک "کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھ لیا جائے لیکن کس کو اس سے انکار ہوگا کہ "تازیانۂ عبرت" بھی بسا اوقات وہ کام کرتا ہے جو دعوتِ شوق کا مہمیز مسلسل نہیں کر پاتا۔ اہلِ کارواں کے احساس کو ہر لحظہ بیدار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انہی میں کچھ ہمہ دم ہوشیار اور مستعد افراد موجود ہوں جو اپنے ترانۂ شوق سے، اپنے حرف و حکایت سے ساتھیوں کو تازہ دم رکھیں۔ بچھڑنے والوں کو آواز بھی دیتے جائیں۔ آگے بڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے جائیں۔ ان کے یہاں خود کلامی بھی ہوگی اور سرگذشتِ بلاکشاں بھی، نشتر بھی ہوگا اور مرہم بھی۔ کچوکے بھی ہونگے اور دلنوازی بھی۔ سُوجھ بُوجھ بھی ہوگی اور نری جذباتیت بھی۔ عبارت بھی ہوگی اور اشارت بھی۔ سب کچھ ہوگا لیکن سب کا رُو ئے سخن محدود ہوتے ہوئے بھی عام ہوگا۔ تحریکی ادب کا کنوس اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہوگا لیکن تنوع اور رنگا رنگی کی کمی نہیں ہوگی۔

تحریکی ادب ضروری نہیں کہ صرف جذبہ ہی کو حرکت دے۔ یہ فکر کو بھی حرکت دے سکتا ہے۔ مگر اکساہٹ اس کا اصل عمل ہے ضرور۔ پھر یہ کہ تحریکی ادب صرف "سوزِ یقین" سے "غلاموں کا لہو" گرما کر نہیں رہ جاتا۔ "زلف و مژہ کا سایہ" ڈال کر "راہِ جنوں" کو آسان بنانا بھی اس کا ایک کام ہے۔

فطری تحریکی ادب تحریک سے جنم تو لیتا ہے۔ مگر یہ صرف داخلی تحریک ہوتی ہے از دل خیزد بر دل ریزد کا معاملہ ہے۔ خارجی تحریک، خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی، افادیت کا صرف ایک پہلو رکھتی ہے۔ تقاضے ہوتے رہیں، ہر بات نقد و نظر کی ترازو پر تُلتی رہے داد ملتی رہے اور بات بنتی رہے۔ خالص ادبی تحریک بھی ہو گی تو وہ ہمہ جہتی بھی ہو گی لیکن تحریک کے مفاد کو پروان چڑھانے والا ادب، خواہ وہ تحریک ادبی ہو یا سیاسی اپنے فوری مقصد کے اعتبار سے یک جہتی ہو گا۔ یہ نہ تو نقد و نظر کا محتاج ہو گا نہ اس کا متحمل۔ کیونکہ "نالہ پابند نَے نہیں ہوتا اور" فریاد کی کوئی لَے نہیں" ہوتی۔ یہاں حُسن معنی کو "منتِ مشاطگی" کی ضرورت نہیں ہوتی۔ " فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی"۔ بولنے والے کا اپنا لب و لہجہ ہی اس کا اپنا فن ہوتا ہے۔ رونے اور ہنسنے کا کوئی فن متعین ہو بھی نہیں سکتا لیکن ایک کردار ساز تحریک کا "دیوانہ" ہر حال میں " بکارِ خویش ہوشیار" ہو گا اسے ستائش کی تمنا" اور "صلے کی پرواہ" نہیں تو نہ سہی لیکن ادائے معنی کی لگن تو ضرور ہو گی۔ وہ ایسا دیوانہ نہیں ہو گا کہ عالمِ جنوں میں جو چاہے بک جائے۔ اور" کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"۔ اس کے براہِ راست مخاطب اس کے اپنے ساتھی ہوتے ہیں، ایکسے ایک سیانے اور وہ بھی انہی میں سے ایک ہوتا ہے۔ اس لئے بولنے سے پہلے اسے سوچنا پڑتا ہے اور سوچنے سے زیادہ اپنے آپ کو تولنا پڑتا ہے۔ جتنا اس کے اپنے کردار کا وزن ہو گا اتنا ہی اس کی ایک ایک بات کا وزن ہو گا۔ ورنہ اس کے قریبی سے قریبی ساتھی بھی سُنی اَن سُنی کر دیں گے۔ تحریک سے خود اس کے اپنے تعلق، اس کی اپنی طبیعت کے رچاؤ، خلوص کی گہرائی اور سیرت کی پختگی سے اس کی آواز میں اثر پیدا ہو گا۔ اثر آفرینی کا ایک راز تو یہ ہے۔ دوسرا راز ہے۔ موقع و محل اور احوال و ظروف

کی کامل مناسبت۔ ۱۹۴۶ء میں "اگر مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا ترانہ الاپا جائے تو اس سے وہ اثر کہاں سے پیدا ہوگا جو بیس سال قبل پیدا ہوا تھا۔ اسی طرح اگر آج سے دس بیس سال بعد احیاء خلافت کی تحریک دوبارہ برپا ہو تو "بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو" تک، بھولے بسرے دور کا سماں پھر کہاں طاری ہو سکتا ہے۔ یہ اپنے اپنے زمانے کے چلتے ہوئے سکے تھے۔ کبھی ان کی ادبی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے جنگی ترانوں (لبالب پیالہ بھرا خون سے۔ فرنگی کو مارا پڑے دھوم سے" وغیرہ) کے مصنفین تک کا کسی کو پتہ نہیں۔ مگر یہ جنگ آزادی کے ترانے تھے تو اپنے زمانے کے تحریکی ادب کے نمونے ہی۔

تحریکی ادب کے بیشتر نمونوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ادبی پایہ بہت زیادہ بلند نہیں بلکہ سرے سے ان کا کوئی ادبی پایہ ہی نہیں۔ لیکن ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ رہی کہ انہیں قبولِ عام کی سند حاصل ہوئی۔ جو تحریک اپنی وسعت کے اعتبار سے جس قدر ہمہ گیر اور اپنے معیار کے اعتبار سے جتنی زیادہ باوقعت ہوگی اس کے تحریکی ادب کے قبولِ عام کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع اور اتنا ہی دیرپا ہوگا۔ تحریکِ جہاد کے زمانے میں مومن جیسے غزل گو شاعر نے مثنوی جہاد لکھی۔ کیا ہمارے لئے اس کے بارے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ تحریکی ادب کا یہ نمونہ کتنا مقبول رہا ہوگا جب کہ زبان و ادب کے اساتذہ اسے آج بھی معیاری قرار دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی ناقدِ ماضی کی تحریکوں سے متعلق تخلیقات کا جائزہ لینے کے لئے بیٹھے گا تو وہ غیر معروف اور گمنام ادیبوں کی مقبول ترین لیکن فنی اعتبار سے ناقص تخلیقات کے حُسن و قبح کو پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ البتہ مومن کی مثنوی جہاد کے ایک ایک لفظ کو پرکھنا اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔

اس وجہ سے نہیں کہ "مثنوی جہاد" کو قبولِ عام کی بڑی سند حاصل ہوئی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ اس کا خالق معروف بھی تھا اور "مسلّم الثبوت" بھی۔

اس سے یہ اصول مستخرج ہوتا ہے کہ کسی تحریکی ادب پارے کے اندر دیکھنے کی چیز بلاشبہ "مردِ غازی کی جگر تابی ہوتی ہے۔ "زینتِ برگستواں" نہیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہو کہ اس کے پیچھے ایک ایسے مردِ غازی کا جذبہ بے اختیار شوق" کارفرما ہے جو ذوقِ سلیم کا بھی حامل تھا اور فن کی نزاکتوں سے بھی آشنا تو "سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر" کو پرکھنے والوں کی ذمہ داری دوچند ہو جائے گی۔ اسی لئے "تہذیب الاخلاق" کے صفحات پر بکھرے ہوئے متعدد ایسے مضامین بھی جن کا تعلق تحریکِ علی گڑھ تک محدود تھا اور جو محض وقتی اور ہنگامی تقاضوں کے تحت لکھے گئے تھے۔ آج بھی زبان و ادب کے ناقدین کی توجہ کے مستحق ہیں۔ سرسید مرحوم اور ان کے رفقاء کے بعض تحریکی انشایئے اور خاکے محض وقتی چیزیں نہیں لیکن وہ آج بھی داخلِ نصاب ہیں۔ شبلی مرحوم کی مثنوی "صبحِ امید" محض بانئ تحریک کی توصیف تھی لیکن اس کی ادبی قدر و قیمت آج بھی مسلّم ہے۔ میں تو حالی کی مسدس مدوجزر اسلام کو بھی تحریکی ادب ہی میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ اسے بانئ تحریک نے اپنی تحریک کی خاطر نہ صرف یہ کہ لکھوایا بلکہ اس پر فخر بھی کیا۔ یہ اور بات ہے کہ حالی کے گہرے خلوص اور رچے ہوئے فنی مذاق نے اسے دائمی قدر و قیمت کا حامل بنا دیا۔ ان تخلیقات کو ہم آج بھی اس لیے لائق اعتنا سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے کہ سرسید اور ان کے رفقاء کا شخصی اور ادبی پایہ مسلّم ہے اور انہوں نے اپنے ادب پاروں میں اپنے خلوص اور ذوق دونوں کا بدرجۂ اتم مظاہرہ کیا ہے۔

تحریکی ادب کے معیاری نمونے، خواہ وہ اشتراکی منشور ہو یا اقبال کا ترانۂ ملّی اور

"پس چہ باید کرد۔ رئیس الاحرار ابوالکلام۔ بہادر یار جنگ اور شیخ حسن البناء شہیدؒ کے خطابات ہوں یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مضامین۔" ایک صالح جماعت کی ضرورت۔" شہادتِ حق"۔ "کیشِ مرداں..." وغیرہ۔ اسرارالحق مجاز کا ترانہ" پاکستان ہو یا مملکتِ پاکستان کا قومی ترانہ، سب کے سب بیشتر وقتی اور ہنگامی ہونے کے باوجود دوامی قدر و قیمت کے حامل اگر ہیں تو صرف اسی بناء پر کہ اپنی اپنی جگہ دل کی بات اپنے اپنے طور پر دل والوں سے کہی گئی اور اچھی طرح کہی گئی۔ "اچھی طرح" کہے جانے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ زبان و فن کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ حال اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھا گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اہم نکتہ ہے اور تحریکی ادب پیدا کرنے والوں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا عام مقصدی ادب کے فن کاروں کے لئے ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ فن کار اگر فن کار ہوگا تو وہ خود اپنے فن پارے کا ابتدائی ناقد بھی ہوگا۔ ورنہ دوسرے ناقدین اسے خاطر میں لانے سے رہے۔

تحریکی ادب کو عام نظریاتی ادب کے ساتھ وہی نسبت ہوتی ہے جو جزو کو کُل کے ساتھ ہوتی ہے۔ برِ صغیر پاک و ہند کی جدید اسلامی تحریک کے علمبرداروں نے تحریکی ادب کے جو نمونے پیش کئے ہیں، تحریک سے باہر کے اصحاب، ذوق کے لئے وہ بھی، اس اعتبار سے لائق توجہ ہیں کہ اگر چہ ان کا روئے سخن محدود ہے۔ ان میں کردار سازی کا مفید عام مواد پھیلا ہوا ہے اور وہ فکر و فن کا اچھا امتزاج پیش کرتے ہیں صداقت اور حُسن جہاں بھی ہو متلاشی رُوحیں اس سے تسکین پا سکتی ہیں۔ تسکین نہ بھی پائیں تو جذبۂ تلاش اور ولولۂ شوق کو اس سے مزید تحریک تو ہو سکتی ہے۔ تحریک اسلامی

کے قائدین کے خطابات، تحریک کی رودادیں، تحریکی رسائل و جرائد کے وہ مضامین اور اداریے جو خالصتہً تحریک کے تقاضوں کے تحت لکھے گئے۔ سرگذشتیں، آپ بیتیاں سوانحی خاکے۔ روزنامچے، رپورتاژ، مکاتیب، احتجاج، تاثرات، ترانے، حتیٰ کہ بعض بیانات بھی اس زمرے میں آ سکتے ہیں اور آتے ہیں۔ مختلف النوع نمونوں کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے لئے چراغِ راہ کے متعلق خاص نمبر (زندانیات نمبر، احتجاج نمبر، مسعود عالم ندوی نمبر، تحریکِ اسلامی نمبر)، "جہانِ نو" کے بعض خاص نمبر (بالخصوص جمہوریت کا جنازہ نمبر، اسعد گیلانی کی متعدد کتابیں (تصویریں۔ انتظار۔ پکار۔ قافلہ سخت جاں، تحریک مجاہدین۔ تحریکِ اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں۔ ساتھی کے نام۔ مولانا مودودی سے ملئے وغیرہ) کے علاوہ "مکاتیبِ زندان" دیارِ عرب میں چند ماہ" "چوہدری علی احمد خان" "المعارف زندگانی" شعرائے کرام میں ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب کی نظم "جماعتِ اسلامی" ماہر القادری کی نظم "ابوالاعلیٰ مودودی" اور شیخ حسن البناء شہیدؒ وغیرہ نعیم صدیقی کی بعض نظمیں "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں۔" "بنام سعاد۔" "چُپ چُپ نہ رہو" "شعلۂ خیال" "رفیقو! آؤ آؤ" "پھر کوئی دیوانہ آ پہنچا" وغیرہ مفید مطلب ہیں۔ یہ تحریکِ اسلامی کے خالص تحریکی ادب کے اچھے نمونے ہیں۔ اسلامی ادب کے سمندر میں ان تحریکی ادب پاروں کی مثال محض چند موجوں کی ہے جو ایک خاص انداز سے اٹھتی رہی ہیں اور دوسری بہت سی موجوں اور لہروں کو جنم بھی دیتی رہی ہیں۔ اور ان کی جولانی کا دم خم بھی ان سے قائم رہا ہے۔ اہلِ ساحل صرف تھپیڑوں ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیچ منجدھار کی لہروں تک ان کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی۔ حالانکہ ان لہروں کا خم و پیچ بھی قابلِ دید ہو سکتا ہے۔ ابھی حال ہی میں تحریکِ اسلامی کے دو جواں سال قائدین نے اپنی تحریکی زندگی کی ابتدائی سرگذشت بیان کی ہے۔ میری مراد ہے خرم جاہ مراد

اور پروفیسر خورشید احمد سے یہ جذبات و شعور کا مجمع البحرین ہے اور ان کا یکجا مطالعہ بہتوں کے لئے دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے۔

تحریکی ادب پاروں کا تعلق براہِ راست امورِ داخلہ سے ہوتا ہے لیکن امورِ خارجہ سے بھی اس کے ڈانڈے ملائے جا سکتے ہیں اور تحریک سے باہر کے ناقدین ان پر بڑے شوق سے "پروپیگنڈا" کا حکم لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہلِ تحریک کو اس پر کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ پروپیگنڈا ہی کا تو سارا کھیل ہے جو ہر طرف کھیلا جاتا ہے۔ برائی دراصل پروپیگنڈے میں نہیں ہوتی۔ اگر ہو سکتی ہے تو مقاصد اور حصولِ مقاصد کے مختلف ہتھکنڈوں میں ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ سچ بولنے کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ سلیقہ سچ بولنے کے لئے درکار ہے۔ جھوٹ کے لئے سلیقہ کی نہیں چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ بولنے میں اگر سلیقہ اختیار نہ کیا جائے گا تو سچ جھوٹ تو نہ بن جائے گا۔ البتہ تہذیب کے وہ نازک اصول ضرور پامال ہوں گے جو ذوقِ سلیم کو سہارا دیتے ہیں افراد کا نام لینا۔ کسی واقعہ کی پردہ کشائی کرنا۔ دوستوں اور بزرگوں سے کچھ کہنا۔ کسی کو کوئی نصیحت کرنا۔ اپنوں کو مفید مشورے دینے اور غیروں سے انصاف چاہنا۔ یہ ساری باتیں سلیقہ کے بغیر کی جائیں تو ان میں بھونڈا پن یا تصنّع پیدا ہو جائے گا نوخیز اسلوبی۔ بے ساختہ پن اور خلوص سے بعض اوقات "خالص اشتہاری" باتیں بھی نمونۂ فن بن جاتی ہیں۔ اخباروں میں کبھی کبھی اس قسم کے فنکارانہ اشتہارات دکھائی دے جاتے ہیں۔ جن کے تراشے محفوظ کرتے کا خیال آدمی کے خیال میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہو گا۔ دوسرا طریقہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مثلاً کاغذ سازی کی ملکی صنعت کی ترقی کے لئے " کاغذی پیرہن ہے" اور نقش فریادی

کے رموز سے بات شروع کی جاتی ہے اور نفسِ مضمون میں بھی کافی دُور تک ایسے ایسے
کنائے اور قرینے سمو دیئے جاتے ہیں کہ بس نگہِ انتخاب کی پسلی پھڑک اٹھتی ہے۔ میں یہ
نہیں کہتا کہ اس قسم کے "معیاری" اشتہارات کا بھی ایک مجموعہ شائع ہونا چاہیئے اور اس
پر آدم جی پرائز دلوانے کی کوشش کی جانی چاہیئے یہ اور بات ہے کہ اگر کسی منچلے نے
یہ حرکت کی تو کم از کم کامرس کے صاحبِ ذوق طلباء کے لئے تو یہ کوشش ضرور مفید ثابت
ہو گی۔ لیکن بعض ایسے اخباری اداریوں کو آپ کیا کہیں گے جو ادبی اعتبار سے بھی نک
سک سے بالکل درست ہوتے ہیں۔ ہوتے تو وہ بھی پروپگنڈا ہی ہیں۔ لیکن سخت کافر
ادب ہوگا جو ان کی ادبیت سے انکار کرنے کی جراءت کرے گا۔ ہمارے ملک میں تو نہیں
مغربی ممالک میں اس قسم کے اداریوں کے انتخاب شائع ہوتے ہیں اور انہیں صحافتی ادب
کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ آج نہیں تو کل ہمیں یہ گُر بھی شاید اہلِ مغرب ہی سے
سیکھنا پڑے گا کہ ایک اچھا ادیب اچھا صحافی نہ بن سکتا ہو تو نہ سہی لیکن اچھے صحافی کے
لیئے اچھا ادیب ہونا خود صحافت کے بہترین مفاد کی خاطر ضروری ہے۔

چلیئے خطابت، صحافت اور نصیحت کو پروپیگنڈا لٹریچر ہی مان لیجئے۔ لیکن اس صنعت
میں اگر صنائع و بدائع اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہو اور پھر بھی طبیعت
ابھر نہیں آتی۔ تو ہمیں بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے اور
اس کا مناسب علاج ہونا چاہیئے۔ ایک بہاری دوست نے مجھ سے کہا "میں روٹی نہیں
کھاؤں گا۔ کھانا کھاؤں گا" کھانا سے ان کی مراد تھی دال بھات اور سالن۔ ایسے بہت سے
لوگ (بہار میں بھی اور بنگال میں بھی) موجود ہیں جو روٹی کو کھانا نہیں سمجھتے۔ ممکن ہے پنجاب
والے صرف روٹی ہی کو کھانا سمجھتے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے معاملات میں عصبیت سے

زیادہ عادت کو دخل ہوتا ہے۔ اہلِ ذوق کو چاہئے کہ غالب کی رواداری سے سبق حاصل کریں۔ غالب آم کے عاشق تھے لیکن آموں میں امتیاز کو کچھ زیادہ روا نہیں رکھتے تھے "میٹھا ہو اور بہت سا ہو" اس معاملہ میں بس یہ تھا ان کا واحد معیار۔ عاشقی کے معاملے میں بھی دوستوں کو وہ یہی تلقین کیا کرتے تھے کہ "شہد کی مکھی نہ بنو" ادب کے معاملے میں ہمیں ذرا روادار اور وسیع النظرف بننا پڑے گا۔ تاریخی ناولوں کے بارے میں بھی یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ ان کو ادب کے ذیل میں شمار کیا جائے یا نہیں۔ جاسوسی ناولوں کو ہمارے یہاں آج تک ادب سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ بے چارے نظیر اکبرآبادی کو بھی ان کے معاصرین اور معاصرین کی اولاد نے شعراء کی برادری سے خارج تصور کیا لیکن آج ایک گروہ اسے مشرق کا سب سے بڑا شاعر قرار دینے کے درپے ہے اور اس کے لئے جو دلائل اور شواہد پیش کئے جاتے ہیں ان پر ہمیں غور کرنا پڑتا ہے۔

جہاں عادت سے زیادہ طبیعت کا دخل ہوتا ہے وہاں اور بھی دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ عصبیت کا ازالہ اتنا آسان نہیں جتنا عادت کا سدھار آسان ہے۔ عصبیت ہی تو تھی جس نے نسیم حجازی کے عظیم تاریخی ناولوں کو ادب کے بڑے بڑے "جاگیرداروں" کے لئے ناقابلِ اعتناء بنائے رکھا۔ اس کے ضخیم اور مقبولِ عام ناولوں سے جلنے والے ترقی پسندوں نے اسے رجعت پسند کی گالی دی۔ "نسیم حجازی" کو "نسیم جہازی" تک کہا گیا۔ نظریاتی عصبیت نے "خاک و خون" کو فرقہ پرستانہ پروپیگنڈا اور "آگ کا دریا" کو عظیم ناول قرار دینے کی ذہنیت پیدا کی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ بنیادی انسانی فطرت پر ہمارا ایمان ہے اور یہ اپنا کام کرکے رہتی ہے۔

"تحریکی ادب" کے بارے میں ایک عرصے تک میں خود یہ سمجھتا رہا کہ یہ تقسیم در تقسیم

صالح ادب کی وسعت پذیری کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ اسعد گیلانی صاحب کے بہت سے تحریکی مضامین پڑھنے کے بعد مجھے بطرزِ دگر سوچنا پڑا۔ عصرِ حاضر کو سب سے زیادہ ضرورت ہے کردار کی۔ کردار سازی کا کام ادب سے بھی لیا جا سکتا ہے اور حیاتِ انسانی کے بعض گوشے ایسے ہیں جہاں رمز و ایما سے زیادہ راست انداز ہی کارگر رہتا ہے بقول اقبالؒ۔

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

"رمز و ایما" اس زمانے کے لئے موزوں ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ہر طبیعت کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ بعض طبیعتیں ہیر پھیر کی باتوں سے سخت اُلجھن محسوس کرتی ہیں عارف ہوں یا عامی طبائع کا اختلاف ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ ایک ہی مرض مختلف طبیعتوں کے اشخاص کو لاحق ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک ہی نسخہ ہر مریض کے لئے کارگر نہیں ہوتا۔ کہیں صرف نفسیاتی علاج بھی کام کر جاتا ہے اور کہیں دوا کی بڑی خوراک ہی کام کرتی ہے تحریکی مضامین میں لطافت تو ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے (یہ ادیب کے اپنے ذوقِ لطیف پر منحصر ہے) لیکن محض لطافت کی خاطر تحریکی ادب کا خالق اپنے مدعائے ضروری الاظہار کو خبط نہیں ہونے دیتا۔ اس کا خاص مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ تعمیرِ کردار اور اس کا عام انداز ہوتا ہے راست اور دو ٹوک۔ اسے بسا اوقات کھل کر ہی بات کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ حنظل کو حنظل ہی کہے گا اور شہد کو شہد۔ اسعد صاحب اس معاملے میں اور بھی سخت ہیں وہ معمولی سی رورعایت کو بھی مداہنت تصور کرتے ہیں۔ اس سے ان کے خلوص اور دلسوزی کا پتہ چلتا ہے ورنہ جہاں تک ذاتی طور پر ان کے اپنے تحمل کا سروکار ہے وہ خاصے بُردبار

اور روا دار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے تحریکی مضامین تو تحریکی مضامین عام اسلامی ادب پاروں پر بھی "پروپیگنڈا" کا الزام خندہ پیشانی سے قبول کرلیں گے۔ لیکن اس میں خود الزام عائد کرنے والوں کے لئے بہت بڑا خطرہ پوشیدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مضامین اسعد کی سلاست اور روانی، جوش اور آہنگ کو یا تو وہ سراہنے سے ہچکچائیں گے یا اگر اس کا نوٹس لینا ہی پڑا تو ان کی ادبیت کا کسی نہ کسی طرح اقرار کرنا ہی پڑے گا۔

میں اسعد صاحب کے فن کے بارے میں ان کے تمثیلی مضامین کے مجموعہ "آدم کے تین بیٹے" کے ضمن میں "چند باتیں" پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ یہاں ان کا اعادہ لاحاصل ہے۔ رہے ان کے تحریکی مضامین تو اوپر جو کچھ لکھ آیا ہوں اس کی روشنی میں یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسعد صاحب کے منتخب تحریکی مضامین میرے نزدیک کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

یہاں تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے ان کو حسب ذیل بنیادی نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

تحریکی ادب عام نظریاتی ادب کے سمندر میں ساحل سے دُور، اٹھنے والی لہروں کی مانند ہے۔ اس کا کنوس زیادہ وسیع نہیں لیکن تنوع اور رنگا رنگی بہت ہوتی ہے۔

تحریکی ادب جذبہ اور فکر دونوں کو حرکت دیتا ہے۔

تحریکی ادب ایک کردار ساز ادب ہے۔ لوٹنے والے کے اپنے کردار کے وزن ہی سے اس میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اثر آفرینی کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے۔

تحریکی ادب کی قدر و قیمت، دائمی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے خالق نے زبان و بیان کی نزاکتوں کا خیال رکھا ہو اور حال کے علاوہ مستقبل بھی اس کے پیشِ نظر رہا ہو۔

تحریکی ادب اگر حسن وصداقت کا قابلِ قدر امتزاج پیش کرتا ہے، تو خواہ اسے پروپیگنڈا پر محمول کیا جائے لیکن سلیقۂ دلنوازی کے سبب اس میں ایک خاص قسم کی دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے ؎

جوانوں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

خطابت ہو یا صحافت، زبان وادب کے معیار پر اگر پورا اُترتی ہے، پھر بھی طبیعت ادھر نہیں آتی تو طبیعت کی اصلاح ہونی چاہیئے۔

اسعد صاحب کے عام نظریاتی ادب پارے اور ان کے خالص تحریکی ادب پارے باہم بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں کیونکہ وہ ہر حال میں بڑی حد تک صاف گو ہیں انشاء پرداز ہیں لیکن چبا چبا کر بات کرنے کے عادی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اسعد صاحب کے تمام تر تحریکی مضامین پر یہ ساری کی ساری باتیں کم وبیش صادق آتی ہیں۔

"تحریکی ادب" سے خود اسعد صاحب کی کیا مراد ہے۔ اس کا حوالہ اوپر ایک جگہ آچکا ہے۔ "تصویریں" "پکار" "انتظار" "قافلۂ سخت جاں" اور "ساتھی کے نام"۔ تحریکی ادب پاروں کے اِن پانچ مجموعوں کا "حرفِ اول"، ان کے اپنے تحریکی ادب کے تصور کو واضح طور پر پیش کرتا ہے۔ "تصویریں" کے حرفِ اول میں انہوں نے لکھا ہے۔

"ایک بات جیسی کچھ واقع ہوئی ہو اگر اسے نہایت خفیف ادبی اندازِ اظہار کے ساتھ مفصل طور پر ویسے ہی بیان کر دیا جائے تو اس واقعہ کی ایک حقیقی تصویر کھنچ جاتی ہے انہیں رپورتاژ یا روداد سے کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

"پکار" کے حرفِ اوّل میں انہوں نے اپنے تحریکی مضامین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :۔

" ادب کی یہ قسم ہلکے پھلکے انداز میں مقصدِ زندگی کو زندہ و پائندہ رکھنے اور تابندہ ترکرنے کے کام آتی ہے۔ یہ مضامین رفقاءِ سفر کے جذبات کے لئے ولولہ اور رفتارِ سفر کے لئے مہمیز کا کام دے جائیں تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔"

"انتظار" کی اشاعت کا زمانہ وہ تھا جب پاکستان فوجی اقتدار کے تسلط میں آگیا تھا اس کے حرفِ اوّل کا سوز و ساز ملاحظہ ہو۔

"کسی مقصد کے حصول کے لئے اجتماعی ادارے بنتے ہیں اور منتشر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن دلوں میں اگر مقصدِ زندگی کا عشق زندہ رہے اور پیہم بڑھتا رہے تو اس سے کچھ فرق نہیں آتا کہ کب مخالف حالات کے بادل گھر کر آگئے اور کب چھٹ گئے :

گویا بقولِ اقبال ؎

ریت کے ٹیلوں پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

وہ خضرِ بے برگ و ساماں وہ سفرِ بے سنگ و میل

جب "قافلہ سخت جاں" کی داستان انہوں نے مرتّب کی تو اس کا انداز جیل سے لکھے ہوئے خطوط کا تھا۔ اپنے ان "مکاتیب" کے بارے میں اسعد صاحب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ :۔

" میرا مکتوب الیہ خاموش طبع، دُور افتادہ، چھوٹے سے قصبہ کا رہنے والا تحریکِ اسلامی کا ایک فعّال اور مستعد نوجوان کا رکن ہے۔ یہ کوئی متعین شخصیت نہیں ہے۔ اُردو میں قاضی عبدالغفار کے مرتّب کردہ "لیلٰے کے خطوط" اور انگریزی

میں گولڈ اسمتھ کی کتاب "چائنا مین کے خطوط" اس اسلوب کا اچھا نمونہ ہیں"۔

"تحریکی ادب" کے بارے میں ان کا حرفِ اوّل خواہ حرفِ آخر نہ ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں غالباً اسعد گیلانی پہلے ادیب ہیں جنہوں نے تحریکی ادب کی ضرورت اور قدر و قیمت کا خاص طور پر اندازہ کیا اور عملاً اس صنف کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ تخلیق کیا۔ ان کے مجموعہ "انتظار" میں ایک مضمون "دعوت، فہم اور جذبہ" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں انہوں نے جذبہ پر اصل زور دیا ہے جو اگر موجود نہ ہو یا جس کی آبیاری نہ ہو رہی ہو تو فہم بھی ناکافی اور نامکمل رہتا ہے اور مؤثر سے مؤثر دعوت اور اپیل بھی کارگر نہیں ہوتی۔ اس اساسی نکتے کے ساتھ اگر ایک ذیلی نکتے کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو تحریکی ادب کا معیار مطلوب آسانی سے متعین ہو سکتا ہے۔ وہ ذیلی نکتہ یہ ہے کہ فہم و جذبہ کو اُکسانے اور ترقی دینے کے لئے دعوت، پیغام یا اپیل کا انداز اور اسلوب موزوں اور مناسب ہونا چاہیئے۔ زبان کا معاملہ انداز اور اسلوب سے الگ نہیں ہے۔ رہی کسی خاص ہیئت یا مختلف ہیئتوں کی بات تو اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ موقع و محل اور فن کار کی اپنی صوابدید پر اور اس کے اس اندازے پر موقوف ہے کہ کس وقت کہاں کونسی ہیئت کارگر ہو گی۔ قدح خوار کو فنجان نہیں دیں گے اور شیر خوار کو ماد اللحم نہیں پلائیں گے۔ اسعد صاحب نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے

اسعد صاحب کے تحریکی مضامین کے پانچوں مذکورہ بالا مجموعوں میں سے اگر الگ الگ موضوع وار انتخاب مرتب کیا جائے تو میرا خیال ہے کہ پانچ چھ انتخابات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہیں پر یہ نکتہ سمجھ میں آئے گا کہ تحریکی ادب کا کینوس زیادہ وسیع نہیں ہوتا لیکن تنوّع اور رنگا رنگی کی کمی نہیں ہوتی۔ مثلاً انتخاب کے یہ پانچ مجوزہ خاکے

ملاحظہ ہوں:۔

انتخابِ اوّل:۔ سرحدِ ادراک سے پرے۔ دعوت۔ فہم، جذبہ۔ مولانا مسعود عالم ندوی۔ ایک عزیز ہم سفر۔ ایک اخبار کی کہانی۔

انتخابِ دوئم:۔ احتجاج۔ مولانا مودودی گلی کوچوں میں۔ یک زمانہ صحبتے با اولیاء۔ "رودادِ چمن" (از قافلۂ سخت جاں) تحریکِ اسلامی (از "پکار")

انتخاب سوئم:۔ اسلام اور وقت کے تقاضے۔ بڈھے مجاہد کی وصیت۔ میرا دل چاہتا ہے۔ چاند کا سلام۔ آزادی کا ماتم۔

انتخابِ چہارم:۔ دِل میں ایک جگہ۔ اسلم مرگیا۔ اسلم زندہ ہے۔ گریز پا (کسی مجموعہ میں شامل نہیں)، ایک ایڈیٹر۔ ایک وزیر۔ مسٹر اٹیلاف (یہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے)،

انتخاب پنجم:۔ اسلامی عجائب گھر۔ نیا اسلام۔ جدید اسلام۔ ان کے علاوہ ہر قسم کے مضامین کا ایک CROSS SECTION مرتب کیا جا سکتا ہے۔ "چاند کا سلام" آزادی کا ماتم" "انتظار، انتظار، انتظار" "مسٹر فلاں کے نام"۔ "میں اور میرا سایہ" "سرحدِ ادراک سے پرے" "ایک ایڈیٹر ایک وزیر" "احتجاج" "اسلامی عجائب گھر" اور رودادِ چمن۔ اس قسم کے CROSS SECTION کا ایک اچھا نمونہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب انتخاب کی بات آئی تھی تو میں نے وقت اور حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی آخر الذکر انتخاب کی تجویز پیش کی تھی اور اپنی اس تجویز میں ترمیم کی گنجائش رکھی تھی کیونکہ کوئی تجویز حرفِ آخر نہیں ہو سکتی

اسعد صاحب اپنی تحریکی آپ بیتی کے ابتدائی باب میں لکھتے ہیں:۔

" میں نے اپنی زندگی میں شاید کبھی اتنی مسرت محسوس نہ کی تھی جیسی اس روز

محسوس کی۔ جیسے میں کھو گیا تھا۔ اور پھر میں نے اپنے آپ کو پالیا۔ گویا میرا اونٹ میرا تمام
زادِ راہ لے کر جنگل میں کھو گیا تھا۔ فاصلہ دور تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے ابھر
آئے تھے۔ کہیں پہنچنے کی اب کوئی امید نہ رہ گئی تھی اور مایوسی گھیر رہی تھی اور میں نے
اچانک دیکھا کہ میرا وہ اونٹ میرے سامنے کھڑا ہے۔

(سرحدِ ادراک سے پرے)

انہیں اپنے جُرمِ حق گوئی کی پاداش میں ایک وزیر کے سامنے پیش ہونا پڑا تھا
اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے اور کس خوبی سے ایک بودے کردار کا خاکہ اُڑایا
ہے۔

" دیکھئے کمیٹی میں وزیر صاحب بھی موجود ہیں۔ ابھی آپ کو بلایا جائے گا۔ میری بات
سنیئے۔ بالکل بحث کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ جو کچھ کہیں۔" جی حضور غلطی ہوئی" کہئے۔
اور یہ بھی کہ" آئندہ ایسا نہ ہوگا۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا" اور ہاں ان کو بالکل
محسوس نہ ہو کہ آپ سرکش یا ضدی ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ جو کچھ کہیں خاموشی سے سنیئے
اور کچھ نہ کہیئے۔ بس اسی میں فائدہ ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں" انہوں نے مزید
سمجھایا (ایک ایڈیٹر ایک وزیر)

اس ایڈیٹر نے جس" اخبار کی کہانی سنائی ہے وہ خود اس کے کردار کی پختگی کی کہانی
ہے۔ اس کے مجموعہ" تصویریں" میں وہ کہانی پڑھی جاسکتی ہے۔ اور جب اس کی ڈاک پر
پہرے بٹھائے گئے تو سنسر کے محکمہ کو اس نے یوں خطاب کیا۔

" میرا دماغ صرف یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ حکومت کا تختہ الٹنے کا جو پلاٹ میں بنایا
کرتا ہوں۔ وہ بھلا کیسے آپ میرے خطوط میں پا سکتے ہیں اور اس سعیٔ بلیغ کے ذریعہ

آپ کیا حاصل کرنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ اسے میرے خطوط میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن اگر میرے خطوط کی چھان بین چھوڑ کر اپنے گرد و پیش میں بھی دیکھتے، اپنی بستیوں میں بھی دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس پلاٹ کے تو باقاعدہ اڈے ہم نے بستی بستی قائم کر رکھے ہیں۔" (مسٹر فلاں کے نام")

وہ خفیہ پولیس کی "قابلِ رحم" حالت یوں بیان کرتا ہے:۔

"اس کے ساتھ جو سب سے بڑی مشکل ہے وہ یہ ہے کہ وہ میرا سایہ بنایا گیا ہے۔ اور اس کے فرائض میں سے ہے کہ میرا سایہ بنا رہے۔ ایسے موقعوں پر اس کی مجبوری بڑی قابلِ رحم اور اس کی بے ضمیری سخت نفرت انگیز ہوتی ہے۔۔ یہ کام چور بھی ہوتا ہے کیوں کہ اس کا کام ذلت آمیز ہے۔ ندامت اور مسلسل ضمیر کے کچوکے اسے الگ پریشان کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کام چوری بھی بہت کرتا ہے (میں اور میرا سایہ) غالب نے کہا تھا:۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

اسعد گیلانی کہتے ہیں:

"یہ چاند، عید کا یہ آبدار خنجر تو انہی سپاہیوں کو مبارک باد دیتا ہے جو یہ عزم رکھتے ہوں کہ وہ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کے خون سے خریدا گیا تھا اور بہت گراں خریدا گیا تھا، اسلام کا اقتدار قائم کریں گے (چاند کا سلام)

"آزادی کا ماتم" وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"یہ کیسا مجاہد ہے جس نے تلوار کے حصول کے لئے دن رات ایک کر دیئے اور

جب تلوار حاصل ہوگئی تو میدانِ جہاد سے فرار کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ کیسا عشق ہے۔ جو محبوب کے کوچے میں آکر ہی سرد ہو گیا ہے۔ پندرہ اگست کا یہ دن حیران و ششدر کھڑا ہے۔ (آزادی کا ماتم)

وہ کہتے ہیں :-

" مجھے اس دن کا بھی انتظار ہے جب اس ملت سے حساب طلب کیا جائے۔ جو یزیدوں کو پالتی اور حسینوں کی شہادت پر چپ چاپ خاموش تماشائی بنی رہتی ہے " (انتظار ۔ انتظار ۔ انتظار)

اسلام کا راستہ روکنے والی مقتدر قیادت نے جب تحریکِ اسلامی کے قائد کو سزائے موت کا حکم سنایا تو پورا عالمِ اسلام اس پر چیخ اٹھا۔ پاکستان کے دارالحکومت کے ہوائی اڈے پر وقت کے وزیرِ اعظم کا استقبال ہونے والا تھا۔

" اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ ان کے ہاتھوں میں لپٹے ہوئے بینرز ملفوف طوفان تھے جو کھلنے پر آفت ڈھانے والے تھے اور آنے والے کے عوامی لیڈری کے خوابِ مقبولیت کو پریشان کر دینے والے تھے۔ (احتجاج)

اور اسلامی عجائب گھر کی سیر یوں کرائی گئی ہے :-

" آج کوئی اس کام کے لئے اُٹھے جس کے لئے اس عجائب خانہ میں سجائی ہوئی محترم ہستیاں اٹھتی رہی ہیں تو اس کے ساتھ بھی وہی طرزِ عمل روا رکھا جائے گا۔ اس پر کیچڑ اچھالا جائے گا۔ اسے بدنام کیا جائے گا۔ اسے غدار قرار دیا جائے گا اسے جیل اور پھانسی کی کوٹھڑیاں دکھائی جائیں گی اور جب وہ اس دنیا سے اپنا وقت پورا کر کے گذر جائے گا تو اس کی یاد میں ادارے قائم ہو جائیں گے۔ کتابیں تصنیف ہو جائیں گی۔ یوم منایا جائے گا۔

اور اسے اٹھا کر اسی عجائب گھر میں سجا دیا جائے گا۔

(اسلامی عجائب گھر)

تحریکِ اسلامی کے ادیبوں میں تحریکیت کا رچاؤ اور اسلوب کی ہمواری صرف اسعد گیلانی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کی انشاء پردازی۔ ان کی خطابت، ان کی سلاست اور زورِ بیان، ان کی نقش گری، اور روداد نگاری، ان کی صاف گوئی اور "جارحیت" یہ سب کچھ ان کی انتہائی مخلصانہ تحریکیت ہی کا نتیجہ ہے۔ ان باتوں میں جہاں جہاں گھن گرج کی کیفیت نظر آتی ہے وہ بھی تحریکی محاذ کی حق گوئی و بے باکی والی خطابت ہی کا پرتو ہے۔ "آدم کے تین بیٹے" کا آخری باب (تیسرا جو بیدار ہو رہا ہے) اس کا بہت اچھا نمونہ ہے اور تحریکی مضامین میں اسے بھی شامل کیا جا سکتا ہے "اسلامی" کا تمثیلی خول بہت ہلکا پھلکا سا ہے۔

اسعد صاحب کے تحریکی خلوص کا اظہار ان کے مضامین میں بدرجۂ اتم ہوا ہے۔ ابلیس معاش کی دھمکی پر، مولانا مودودی گلی کوچوں میں "تحریک اپنے لٹریچر کے آئینے میں"۔ "مولانا مودودی سے ملئے۔ تحریکِ مجاہدین کا انقلابی پہلو" چوہدری علی احمد خان مرحوم بڈھے مجاہد کی وصیت۔ ان مضامین اور کتابوں میں اسعد گیلانی کی تحریکی شخصیت کے پختہ خدوخال بہت صاف اور نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے لٹریچر سے اتنی تعداد اور اتنی مقدار میں اقتباسات کسی نے نقل نہیں کئے ہوں گے۔ جتنے اسعد صاحب نے کئے ہیں۔ اس سے بھی ان کے شغف اور گہرے لگاؤ بلکہ لگن کا اظہار ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر انتخاب اسعد صاحب کے تحریکی مضامین کے بارے میں قارئین کو ایک جامع تاثر دے سکے گا۔ ان مضامین میں اسعد گیلانی کے تفکر، خلوص

اور انشاء پردازی تینوں عناصر کا بہت اچھا امتزاج نظر آئے گا۔ زبان کی سلاست، بیان کی صفائی اور احساس کی شدت اور گہرائی ہی ان کی اثر آفرینی کا راز ہے اور پھر یہ کہ وقت کی آواز بھی ہے جو ان میں گونج رہی ہے۔ یہ مضامین خاص طور پر ان طبائع کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوں گے جو تعمیری رجحان رکھتے ہیں اور تعمیر کردار کے لئے آمادہ ہیں۔ میں اس انتخاب کو اہلِ ذوق کے آگے یہ کہہ کر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ۔

؎ شعلہ سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پُر سوز میں خلوت کی تلاش

اقبالؔ

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ان مضامین کا دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہو اور وہ منزل قریب سے قریب تر آئے جس کا ہم سبھوں کو انتظار ہے اور جسے چاند جھک کر سلام کر رہا ہے۔

فروغ احمد
شعبۂ اردو قائدِ اعظم کالج، ڈھاکہ

۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء

یہ مجموعہ

تحریکی ادب پاروں کا زیرِ نظر منتخب مجموعہ اردو ادب اور خصوصاً اسلامی ادب میں ایک "بدعت" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب فروغ احمد نے اپنے دیباچے میں تحریکی ادب کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں، ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو اردو ادب میں تحریکی نگارشات خال خال دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ ترقی پسندوں کے ہاں مل جائیں گی اور کچھ اُن سے پہلے۔ اور اسلامی ادب میں بھی جناب اسعد گیلانی کے علاوہ جن دوسرے مصنفین کے ہاں تحریکی ادب کے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادب پاروں میں تحریکیت زیادہ ہے اور ادب کم۔ مدلل اور ٹھوس استدلالی اندازِ بیان نے ان تحریروں کو مقالات بنا دیا ہے۔ جناب اسعد گیلانی کی زیرِ نظر نگارشات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ نگارشات مثالی ادب پارے اور انشائیے ہونے کے باوجود رُوح کے اعتبار سے

تحریکی ہیں۔" بیچاری کتابیں" جیسے مزاحیہ انشائیے کی تہہ میں بھی جو مزاجاً دوسرے مضامین سے علیحدہ نظر آتا ہے۔ مصنف کے تحریکی شعور کی رَو اندر ہی اندر چلتی نظر آتی ہے مصنف کے احباب اس کی کتابیں بے دریغ ضائع کر دیتے ہیں، گُم کر دیتے ہیں اور پھاڑ کر بوسیدہ و خستہ حالت میں واپس کرتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو جھنجھلاتے ہیں اور نہ ان سے قطع تعلق کرتے ہیں: " مجھ میں یہ کمزوری بہر حال موجود ہے کہ میں کتابوں کے ساتھ احباب کو بھی ضائع کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔" کتابوں پر احباب کے مشقِ ستم کے باوجود وہ انہیں کتابیں دیئے جاتے ہیں۔ کیوں کہ کتابیں پڑھوانا بہر حال ان کی تحریکی کمزوری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمزوری میں تحریکی شعور رکھنے والا کوئی فرد ہی مبتلا رہ سکتا ہے۔

جناب اسعد گیلانی کی ایسی تحریریں پڑھنے کے بعد قاری ایک اعلیٰ درجے کے ادب پارے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکی تاثر بھی قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان تحریروں میں منطق کی کمی اور جذبے کی فراوانی ہے۔ فکر، جذبے تلے دبی دبی نظر آئے گی مگر جذبے کی صداقت ہمیں فکر کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

جناب فروغ احمد نے یہ سب اور بہت سی ایسی دوسری باتیں کہہ دی ہیں اس لئے میں انہیں دہرانے کے بجائے اس مجموعے کی ترتیب میں چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

تحریکی ادب کی اس صنف کو شعوری طور پر سب سے پہلے جناب اسعد گیلانی نے ہی اپنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی اب تک کی تحریکی نگارشات کو دیکھ کر نثری ادب کی ایک نئی صنف "تحریکی ادب" انگڑائی لیتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر جب تحریکی ادب پاروں کا منتخب مجموعہ مرتب کرنے کا خیال درپیش ہوا تو راقم نے حضرات فروغ احمد، آباد شاہپوری اور غلام حسین اظہر کو جناب اسعد گیلانی کی مندرجہ ذیل

تصانیف کا ایک، ایک نسخہ روانہ کیا:۔

۱. قافلۂ سخت جاں

۲. پکار

۳. انتظار

۴. تصویریں

۵. ساتھی کے نام

تاکہ وہ ان کتابوں میں سے تحریکی ادب کے مجوزہ مجموعے کے لئے مضامین کا انتخاب کریں۔ ان حضرات کے منتخب کردہ مضامین کو سامنے رکھتے ہوئے آخری انتخاب راقم نے کیا۔

ایک مضمون ان کی تالیف " چوہدری علی احمد خان مرحوم" سے بھی لیا گیا ہے اور ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جو کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یوں مجھے اس مجموعے کو ان کی ساری تحریکی نگارشات کا منتخب اور نمائندہ مجموعہ قرار دینے میں کوئی جھجک نہیں۔

راقم نے جناب فروغ احمد سے تحریکی ادب کے اس مجموعے پر دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے خرابیٔ صحت کے باوجود ایک طویل دیباچہ قلم بند فرمایا، جس کی موجودگی میں ہم اس مجموعے کو زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

اس مجموعے کے مصنف تحریکی ادب کی " بدعت" کی ترویج میں جس زور شور

کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس کے پیشِ نظر اگر "بارے کچھ مصنف کا بھی بیان ہوجائے،، تو اس سے مصنف کا ذہنی پسِ منظر اور تحریکی ادب سے ان کے شغف کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

جناب اسعد گیلانی کے ذہنی سفر کی داستان مختصر بھی ہے اور طویل بھی۔ طویل یوں کہ ایک ایسا شخص جو سرتاپا مغربی تہذیب و تمدن کا نمونہ ہو۔ دہلی کے امپریئل سیکرٹریٹ میں تاج برطانیہ کا ملازم رہا ہو، ترقی پسند ادبی پرچوں میں چھپتا رہا ہو، جس کی کوئی سمت سفر متعین نہ ہو۔ وہ اگر آج اس سراپے سے قطعی مختلف نظر آئے۔ آج اس میں اگر ترقی پسندی کی خو بو بھی نہ ہو بلکہ تحریک ہی جس کا اوڑھنا بچھونا، مقصدِ زندگی اور حاصلِ زندگی ہو تو لازماً اس عظیم الشان انقلاب کے پس منظر میں ایک طول طویل ذہنی سفر کا خیال آنا بعید از قیاس نہیں۔

لیکن یہ داستان مختصر یوں ہے کہ یہ کایا پلٹ نہایت مختصر عرصے میں واقع ہوئی سُنیئے!

" ایک لمبی مسافت طے کرکے آنے والا مسافر تھا جو مسلسل چلا جا رہا تھا۔ منزل سے بے خبر، فاصلوں کی طوالت سے انجان، تکان اور ادھیڑ بن کا مارا ہوا۔ اسے کہاں جانا تھا؛ کدھر جانا تھا؛ کون تھا؛ کیا کرے گا؛ کیوں آیا تھا؛ کیوں جا رہا تھا کتنی بے اندازہ بے مقصدیت تھی، جس نے اس کی زندگی کو گھیر لیا تھا۔ بگولے اس کے آگے تھے، اس کے پیچھے تھے۔ اس کے دل و دماغ میں تھے، ہم سفر تھے۔ اس کے رفیقِ کارواں تھے۔ اس کی منزل انہیں بگولوں میں کھو کر گم ہوگئی تھی۔"

لیکن خوش قسمتی سے مسافر کو ایک کتاب مل گئی اور:۔

"اس کتاب کے چند صفحات پڑھ کر وہ مسافر گویا نخلستان میں پہنچ گیا، بگولے چھٹ گئے۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔ پیہم مضطرب دل سکون پذیر ہوگیا۔ دھندلاہٹ چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی گویا کسی نے انگلی تھام لی اور ایک راہ کی طرف اشارہ کردیا۔"

ان کی پیدائش آچھ ضلع گجرات (۱۰/ اپریل ۱۹۲۲ء) کی ہے۔ بمبئی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن دوسری جنگ عظیم اور گھریلو حالات سے مجبور ہو کر کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی جسے بعد میں مکمل کیا۔ اب وہ سیاسیات میں پنجاب یونیورسٹی سے اور اردو میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرچکے ہیں۔ کالج چھوڑ کر انہوں نے دہلی جاکر سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ اسی دوران میں انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ۔ "مسافر گویا نخلستان میں پہنچ گیا۔" تب سے آج تک وہ تحریکِ اسلامی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ؏

ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں اے عشقِ خوش عناں

پھر سرکاری ملازمت کو طاغوت کی چاکری سمجھ کر چھوڑ دیا اور ملازمت چھوڑنے کے بعد جالندھر میں ذاتی کاروبار شروع کردیا اور تقسیم ہند کے بعد کراچی سے ہفت روزہ اخبار "جہانِ نو" نکالا۔ اس دَور میں انہوں نے پاکستان کی اسلامی ادبی تحریک کو "حلقۂ ادبِ اسلامی" کی صورت پروان چڑھانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اور اس تنظیم کے پہلے ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوئے اور اس فریضہ کو ۵۴ء تک اپنے جریدہ کی مدد سے انجام دیتے رہے۔

پھر تحریک کے لئے مشرقی پاکستان میں ۲، ۲½ سال تک کام کیا۔ ۱۹۵۶ء میں لائلپور اور ۱۹۵۹ء میں سرگودھا آگئے۔ اس سارے عرصے میں ان کی خدمات و صلاحیتیں تحریکِ اسلامی

کیلئے وقف رہی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ملک کے اعلیٰ ادبی پرچوں میں افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ پھر انہوں نے افسانے، ناول، رپورتاژ، طنز و مزاح۔ سبھی کچھ لکھا لیکن ادھر کچھ عرصے سے وہ تمام اصناف کو چھوڑ کر تحریکی ادب کی تخلیق میں مصروف ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف "ساتھی کے نام" تحریکی ادب پاروں کا ایک نہایت مؤثر مجموعہ ہے۔ انہوں نے حال ہی میں "ادب میں اسلامی تحریک کا مسئلہ" کے عنوان سے اپنے تازہ مضمون میں "ادب برائے تحریک" پر (STRESS) کیا ہے اسی لئے میں نے کہا ہے کہ تحریکی ادب کی تدعستہ کی ترویج میں وہ نہایت زور و شور کے ساتھ مصروف ہیں۔

آخر میں، حضرات فروغ احمد، آباد شاہ پوری اور غلام حسین اظہر کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے زیرِ نظر مجموعے کے انتخاب میں میری معاونت فرمائی۔ اس کے لئے ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا منتخب مجموعہ علیحدہ علیحدہ تیار کیا اور پھر چاروں کے انتخاب میں سے مشترک اور متفق علیہ مضامین کو یکجا کر کے یہ مجموعہ مرتب کر لیا۔ فروغ صاحب کا میں خاص طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے باوجود علالت کے اس مجموعے کا فاضلانہ دیباچہ قلمبند فرمایا۔

رفیع الدین ہاشمی
۴ مئی ۱۹۶۸

ٰ مطبوعہ "سیارہ" لاہور (اگست ۱۹۶۷ء)

سرحدِ ادراک سے پرے

اُن دنوں میں شولاپور میں اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ مشترک دستر خوان کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ جب پھر مجھ پر وہ دورہ پڑا جو گاہے گاہے مجھے کئی کئی ماہ تک جنونِ دینداری میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔

چمن لال آزاد آریہ سماجی خیال کا آدمی تھا۔ وہ ایک اچھا مصوّر تھا، اور کبھی کبھی کچھ ادب پارے بھی لکھا کرتا تھا، اس کے اندر ادب کو سرسبز و شاداب کناروں والی آبناؤں کے لمبے لمبے سفروں نے اور ارنا کولم کے اونچے اونچے تاڑ کے درختوں نے اکسایا تھا جہاں وسیع سمندر کے کنارے اور ڈوبتے ہوئے سورج کے نظارے نے اسے کئی بار اپنے رنگوں کے کیس اور برش کو ہر وقت اپنے ساتھ ہی رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ڈوبتی ہوئی سنہری کرنوں کا ایک جال سا جب لہروں کے اوپر پھیل جاتا اور اس جال میں دُور دُور تک مچھلی

پکڑنے والوں کے شکار سے اور چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں بھی پھنسی ہوئی نظر آتیں تو اکثر حیرانی اور استعجاب سے وہ اس نظارے کو دیکھا کرتا۔ اس کی مصورانہ حس بہت تیز تھی۔

بہت دنوں سے وہ کسی ماڈل کی تلاش میں تھا۔ ایک دوپہر جب ہم دونوں ارناکم سے کوچین چھوٹے سے موٹر بوٹ میں جارہے تھے تو اچانک دو انسان گا گا کر بھیک مانگتے ہوئے ہمارے دوسرے درجے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا، اتنا بوڑھا جتنا کوئی خزاں دیدہ زرد پتہ ہو سکتا ہے، کانپتا ہوا ضعیف انسان۔ لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا، لمبی سفید ڈاڑھی، جگہ جگہ سے پھٹا ہوا میلا چکٹ کوٹ، پاؤں ننگے سر پر ایک لمبا سا کنٹوپ، آنکھیں نیم وا جن میں سے بے کسی، بھوک، بے چارگی اور درد و غم اُبلا پڑ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا اور اپنے ساتھی کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھے اس کے ساتھ پیچھے پیچھے اس طرح متحرک تھا جس طرح قدم قدم چل کر بڑی مشکل سے وہ زندگی اور قبر کا باقی ماندہ فاصلہ طے کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ وہ جوان تھی لیکن صرف اس لئے کہ شاید اسے "میری ننھی" کہنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ پھٹی ہوئی میلی ساری جو ٹخنوں سے اونچی تھی۔ بلاؤز کا تصور بھی شاید اس کے لئے اسراف کی مد میں شامل ہوگا۔ ننگے پاؤں، سانولا رنگ دُبلی پتلی، لیکن اس کے دبلاپے کو اس کی عمر نے بڑی حد تک غیر نمایاں بنا دیا تھا۔ زرد آنکھیں، جیسے کوئی یرقان کا مریض ہو اور دھیمے سروں میں گاتے ہوئے اس کے زرد زرد دانت بھی نظر آتے تھے گویا اس کی جوانی بڑھاپے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بے حال ہوئی جارہی تھی۔

چمن لال اس کی طرف بہت توجہ سے دیکھتا رہا۔ وہ گویا ان کی آمد کا منتظر ہی تھا۔ جب وہ اس کے سامنے آئے تو اس نے اپنی جیب سے چونی نکال کر انہیں دی وہ اپنی نامعلوم ملیالم زبان میں دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"سوامی اُر پیسہ تا۔ مہاراج"

چمن لال انہیں انتہائی انہماک سے دیکھتا رہا اور جب موٹر بوٹ کوچین شہر کے کنارے پر آکر لگا اور سب مسافر اُتر گئے تو وہ ان دونوں بھکاریوں کے قریب گیا اور ان سے چند باتیں کر کے واپس آگیا۔

میں نے پوچھا "چمن لال! تم نے ان سے کیا کہا؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گا" اس نے کہا اور پھر ہم کوچین کے بازار کی بھیڑ میں کھو گئے۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد دو گھنٹے تک وہ غائب رہا۔ کھانے پر بھی دیر سے آیا۔ وہ اگرچہ خالص سبزی خور تھا اور میرا اور اس کا کھانا جب کبھی اختلافِ ذوق و عقیدے کا سوال پیدا ہوتا تو الگ پک جاتا تھا۔ لیکن بالعموم ہم ایک ہی ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اس دن کھانے پر مجھے اس کا کافی انتظار کرنا پڑا۔

باورچی نے میرے لئے بھنے ہوئے گوشت کے مقابلے پہ اس کی تلی ہوئی بھنڈی دوبارہ گرم کی تب وہ آیا۔

"کیوں بھئی آج کس چکر میں پھنس گئے تھے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔ اس لئے کہ وہ بے حد گھر گھستا تھا اور یوں اتنی دیر غائب رہنا اس کے لئے خلافِ معمول تھا۔

میں نے ان کے ساتھ طے کر لیا تھا اگرچہ میں نے ایں بار اپنی ساری تنخواہ پتا جی کو گھر مشاتی بھجوا دی ہے اور نہ بھجواؤں تو وہ کہاں سے کھائیں؟ اس لئے کہ ہمالوالی کی زمین

بڑی ناقص ہے۔ ساری ریت اور ایک دیہاتی ٹیچر بھلا کتنا کچھ کما سکتا ہے؟۔ لیکن پھر بھی میں دفتر سے ایڈوانس، یا شاہ جی سے قرض لے کر پچیس روپے انہیں دے دوں گا۔" اس نے بڑے اشتیاق سے بتایا۔

"کسے دوگے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا اس لئے کہ وہ اس طرح خرچ کرنے کا عادی نہ تھا۔

"اس بھکاری لڑکی کو" اس نے بڑی صفائی سے کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کس بھکاری لڑکی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ موٹر لوٹ کے بعد سے وہ مسلسل اپنے ذہن میں کچھ گنگناتا رہا تھا۔

"کیوں آخر... تمہارے ارادے کچھ نیک نظر نہیں آتے۔ تم تو ایک شریف آدمی ہو چمن لال!" میں نے ایک سنجیدہ بات کو مزاح کے پیرائے میں کہا۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"لیکن میں نے تو ان کے ساتھ طے کر لیا ہے۔ وہ روزانہ بارہ بجے سے تین بجے تک میرا ماڈل رہے گی۔ مجھے اپنے آرٹ کو کامیاب بنانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"مجھے ڈر ہے تمہارے آرٹ کی کامیابی تمہارے اخلاق کو بگاڑ دے گی" میں نے کہا۔

وہ کچھ غم زدہ سا ہو گیا۔

کیا اس سے اخلاق پر کوئی اثر پڑنے کا خطرہ ہے؟ اس نے پوچھا۔

"جب تم تنہا اپنے کمرے میں اسے سٹول پر بٹھائے اپنے ڈھب سے اس کا

پوز بنا کر مسلسل اس کی نقشہ کشی کرتے رہو گے اور اس پر اپنی نظریں گاڑے رہو گے تو مجھے تمہارے اخلاق کے خطرہ میں پڑ جانے کا شبہ ہی نہیں یقین ہے۔"
میں نے کہا۔

"لیکن اس کا بابا بھی تو ساتھ ہو گا۔" اس نے وضاحت کی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے مزید زور دیا۔

وہ کچھ رکا اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا۔

"تم نے سچ کہا، مجھے بروقت بتا دیا، ایسا خطرہ میں بھی اپنے دل کے کسی کونے میں محسوس کر رہا تھا۔ میں آج ہی انہیں منع کر دوں گا۔"

یوں وہ اس خطرے سے بچ گیا جو ہمارے مکان میں داخل ہونے والا تھا۔ ہم دونوں غیر شادی شدہ ایک اجنبی شہر میں اجنبی مسافر تھے، اور اجنبی لوگ اجنبی بستیوں میں جا کر غیر ذمہ داری کے خطرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

اس روز جو اخلاق کی بات ہوئی تو وہ میرے لئے سوچ بچار کا موضوع بن گئی، اور وہی میرے اس دورے کا سبب بن گئی جس کے نتیجے میں میں کئی ماہ تک مسلسل ہر چیز کو اخلاقی پیمانوں سے ناپتا رہا۔

میں اور چمن لال عام انسانی اخلاقی لحاظ سے تقریباً ایک ہی سطح پر تھے۔ ادبی ذوق، کتابوں کے دوست، طبیعت کے سادہ اور اخلاقی اقدار کا احترام کرنے کے قائل ہمارے گرد و پیش میں جو فتنے دن رات اٹھتے تھے انہیں ہم صرف نفرت اور احساسِ برتری کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

کتب بینی کے بعد ہماری دوسری دلچسپی لکھنے لکھانے کی تھی، اور تیسری

دلچسپی کبھی کبھار سینما بینی تھی جس سے ایک خفیف سا احساس گنہگاری دل میں ضرور محسوس ہوا کرتا تھا لیکن ہم اس کے مخالف نہ تھے، بلکہ جب کبھی طبیعت پر غم زندگی کا کوئی دورہ پڑتا تو ہماری جائے پناہ یہی ہوتی۔ فلموں میں ہندوستانی کی بجائے انگریزی اور ڈاکومنٹری فلمیں ہمیں زیادہ پسند تھیں۔

میں دین بیزار نہ تھا لیکن اس کے فہم سے پوری طرح خالی تھا۔ چمن لال بھی اپنی دینداری کی انتہا یہی سمجھتا تھا کہ سبزی خوری کا پورا پورا پابند رہے خدا کی توحید کا قائل رہے اور دیومالائی دیوتاؤں کو صرف آرٹ کے نمونے سمجھے۔ دینداری کا دورہ میرے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ کبھی کبھی اچانک ایک شدید ہُوک مجھے یقین دلایا کرتی کہ تم کو ایک روز مرنا ہے اور مرنے کا یقین اس لئے بھی اہم تھا کہ ہر روز یہاں سے کوئی نہ کوئی مر کر رخصت ہوتا رہتا ہے اور مرنے کے بعد کی تیاری کا لازمی جزو میرے نزدیک دینداری یعنی نماز روزے کی پابندی تھی۔ جب یہ احساس زور کرتا تو میں ادھر مائل ہو جاتا، اور جب کم ہو جاتا تو زندگی معمول پہ آ جاتی اور معمول بے مقصد شب و روز تھے۔

جتنی کچھ گونگی سی دینداری مجھے ورثے میں ملی تھی۔ اس کی جڑوں پہ لکھنؤ کے نیاز فتح پوری نے بہت سے تیشے چلائے تھے۔ اپنے نگار میں وہ عجیب عجیب سوال اٹھایا کرتے تھے اور میں ان کا نگار پڑھا کرتا تھا۔ اس نگار نے میرے ذہن میں جو نقش و نگار دین کے بنائے تھے وہ بڑے مضحکہ خیز تھے۔ الجھے الجھے سوالات کا ایک ریلا وہ ہر ماہ نگار میں اٹھاتے رہتے تھے۔ دین، اساساتِ دین، تصوراتِ دین سب ان کی زد میں رہتے تھے۔ وہ اسلام کو بُرا نہ کہتے تھے لیکن اس کی ایک ایک بات کو رَدّ کرتے تھے۔ وہ اسلام کو گالیاں نہ دیتے تھے لیکن اس کے جزو جزو کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور جو بھی اسلام کا

نام لینے کی جرأت کرتا اسے آڑے ہاتھوں لیتے تھے، اسلام کے بارے میں اعتراضات، سوالات، وسوسے، اوہام، اُلجھے ذہن اور اُلجھی منطق کے ہمالے تھے جو ان کے جریدے کے مطالعے سے قاری کو میسر آتے تھے اور میں اپنا حصّہ پوری طرح ان سے وصول کر رہا تھا۔

" وہ بڑھیا جو جنگل میں رہتی ہے، اور دین اور دین والوں کی تبلیغوں سے بے خبر ہے کلمہ تک نہیں جانتی۔ دوزخ میں جائے گی یا جنّت میں؟ دوزخ میں جائے گی تو کیوں"؟

" لاکھوں انسان جو دنیا کی ترقی اور تمدن کے سنوارنے میں مصروف ہیں اور دنیا کو سائنس کی ایجادات سے بہرہ اندوز کر رہے ہیں۔ دوزخ میں جائیں گے یا جنّت میں اگر یہ سب دوزخ میں جائیں گے تو پھر جنّت میں کون جائے گا!

" وحی اور الہام کیا چیز ہے؟ اور یہ بے تار برقی الہام سے کیا کم ہے؟ ایسے اور ان سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب سوالات ہوتے تھے جو مدیر نگار ہر ماہ اپنے قارئین میں تقسیم کرتے رہتے تھے، ان کا جریدہ پڑھ کر آدمی ہزار شبہات پاتا تھا لیکن ایک یقین بھی اسے میسر آتا تھا وہ آدمی کے سارے یقینیات کو ہلا ڈالتے تھے لیکن اپنی طرف سے اسے کوئی یقین فراہم کر کے نہ دیتے تھے۔ جس کے سہارے وہ کھڑا ہو سکتا اور ان کی سعی و جہد کا یہی منفی پہلو تھا جو ایک نہ ایک دن ان کے قاری کو ان سے بیزار کر کے کسی دوسری منزل کی تلاش میں سرگرداں کر دیتا تھا۔

خدا کے وجود کا تصور شاید انسان کے ذہن کی محض کرشمہ سازی ہی ہو۔ یہ چیز آدمی ان سے پاکر گویا اپنی بڈی کا گودا تک بے یقینی کے حوالے کر دیتا تھا، اور پھر جب اس کے آس پاس استقلالِ حیات کی کوئی بنیاد نہ ہوتی تو وہ فکر و نظر کی بے پایاں

آوارگی میں ٹھوکریں کھایا کرتا۔

آدمی کا کام حیران ہو ہو کر سوال کرتے رہنا تھا۔ وہ آدمی کے ضمیر میں اتنے کانٹے چبھو دیتے تھے کہ جنہیں آدمی اگر یقینِ کامل نہ پا سکے تو عمر بھر چُبھتا رہے اور اگر اسے کوئی اس اتھاہ گہرائی سے نکالنے کے لیے ہاتھ نہ بڑھائے تو اسی فکری آوارگی کی دلدل میں دھنستا چلا جائے۔

ان دنوں میرے ذہن و ضمیر میں نیاز صاحب کانٹے چبھو رہے تھے،

میں نے جب چمن لال کو اخلاق کا درس دیا تو پھر تو ایک مضمحل اور بے جان سا اخلاقی قدروں کا ہیولا ظاہر کرکے میرے وجودِ معنوی پر بھی مسلط ہو گیا۔ میرے دل و دماغ میں ایک زبردست یورش ہوئی۔ میں نے کچھ بے زبان سی ذمہ داریوں کو اپنے گرد و پیش سرسراتے ہوئے پایا۔ کچھ اَن کہی باتوں کو اپنے دل سے سرگوشیوں میں مصروف پایا۔ ایک بے اختیاری کے عالم میں سوچتا رہا۔ اسی روز میں نے نماز شروع کر دی اور دل میں دُعا کرتا رہا کہ خدا کرے مجھے نماز پر یقین حاصل ہو جائے، خدا کرے میں اسے ہمیشہ کے لئے اختیار کر سکوں، خدا کرے میرے دل کو دینی رُخ پر بہنے میں سکون میسّر ہو۔ خدا کرے کوئی اخلاقی تبدیلی شعور کے ساتھ میرے اندر بیدار ہو۔

لیکن میں اخلاقی تبدیلی، دینی رُخ، اور مطلوبہ متعین فکری راہ سے بالکل بے خبر تھا۔

مسلسل دو دن میں اس اضطراب میں مبتلا رہا۔ دل ہی دل میں دُعا کرتا رہا کہ کوئی ایسا یقین حاصل ہو جائے جس سے دلِ و دماغ کی یہ بے یقینی اور اضطراب رفع ہو۔ میری نماز میرے اس اضطراب میں نہایت خفیف کمی کرتی تھی لیکن عقلی

سکون بالکل ہی میسر نہ تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ اضطراب ذہنی تجرد کی وجہ سے تھا۔ لیکن جب ذہنی تجزیہ کیا تو محسوس ہوا کہ اس اضطراب کو ایسی کسی چیز سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس روز میں چمن لال کے ساتھ جب بازار گیا تو مختلف کتب خانوں میں ایسی کتابیں ڈھونڈتا رہا جن کا موضوع اخلاقی اور دینی ہو۔ چمن لال کو اخلاق کا درس دے کر میں خود اخلاقی رَو کی زد میں آگیا تھا لیکن میں خود نہ جانتا تھا کہ اجتماعی اخلاق کا حدود اربعہ کیا ہے۔ شولاپور میں مذہبی کتب خانے بہت کم تھے۔ ان میں جو چند کتابیں ملیں ان سے طبیعت میں اور بھی تکدر پیدا ہوا۔ اس سے پہلے میرے پاس افسانوی اور شعری ادبی کتابوں کے ڈھیر موجود تھے۔

چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد میں نے اپنے بزرگوں سے مدد لینا ضروری سمجھا۔ تین صاحبِ علم خاندانی بزرگوں کے نام میرے خط کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"کچھ دنوں سے میں عجیب ذہنی اضطراب اور بے یقینی میں مبتلا ہوں۔ اسلام کے متعلق ایسی معلومات چاہتا ہوں جن سے دل و دماغ کو سکون حاصل ہو جائے۔ چاہتا ہوں ایسی کتابیں پڑھوں جن سے مجھے اسلام کا کچھ علم حاصل ہو، جس سے طبیعت مطمئن ہو، لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا پڑھوں؟ وہ کونسی ایسی کتابیں ہیں جو میرے اس اضطراب کو قلبی سکون سے بدل سکیں۔ آپ اس سلسلے میں مجھے لکھئے اور میری راہنمائی فرمایئے۔"

تینوں بزرگوں کی طرف سے مختلف اوقات میں مختلف جواب موصول ہوئے۔

"اللہ کے ہاں بخشش کی طرف سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، خصوصاً ایک سیّد کو تو پوری طرح مطمئن ہونا چاہیئے۔ یہ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ تم اس کے حبیب

گے اہلِ بیت میں سے ہو العلم حجاب الاکبر۔ نکتہ کی بات یہی ہے کہ اپنے نسلی امتیاز سے بے خبر نہ رہو، اور اسے بھولو نہیں، اور اس کے شایانِ شان زندگی گزارو۔"
نسلی امتیاز، اور اہلِ بیت ہونے کی بنا پر بخشش کے اطمینان نے میرے دل کو اپیل نہ کیا۔

پھر دوسرا خط آیا جس کا خلاصہ تھا۔

"تم میں یہ اضطراب دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں میرے اندر بھی یہ اضطراب بہت دن رہا تھا اور اس کے لئے میں نے جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ جہاں اسلام ہو وہاں انسانی اخلاق ایک بنیادی شرط ہے۔ اگر چاہو تو اخلاقی کتب کا مطالعہ کرو۔"

بہت دنوں کی تاخیر کے بعد تیسرا چند سطری خط ملا۔

"یہ کوئی مولانا ابوالاعلیٰ ہیں، ان کی ایک کتاب رسالہ دینیات میری نظر سے گزری ہے۔ پرسوں ختم کی ہے۔ ہو سکے تو ان کی کتب پڑھو، اگر کہو تو رسالہ دینیات بھیج دوں۔"
دل نے کہا، یہ کون شخص ہے؟ کبھی نام نہیں سُنا، کبھی کتاب نہیں دیکھی، ایسا محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک لکیر سی کھنچ گئی ہو جس کی اُنگلی تھام کر میں اضطراب کے اس اندھے دریا کے پار نکل سکوں گا۔ اس خط نے ایک سکون سا دل کو دیا، کوئی امید سی دل کے اندر بھڑک اٹھی،

میں نے اسی وقت خط لکھا کہ رسالہ دینیات فوراً پارسل کر دیں، لیکن اسی ہفتے میں تبادلے کے سلسلے میں پنجاب روانہ ہو گیا۔

دل اس نام کو یادداشت کے خانوں میں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے اپنے مطالعے اور

اپنے ادبی ذوق پر افسوس تھا کہ ایسے مصنّف سے اتنے دِنوں بے خبر رہا۔ صرف ایک یادداشت اُبھری، میں جب زیرِ تعلیم تھا تو "انجمن اسلام ہائی سکول بمبئی" کی لائبریری میں اخبار مدینہ کے ایک صفحے پر "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان کے تحت لکھنے والے کا یہ نام دیکھا تھا لیکن میں نے مضمون نہیں پڑھا تھا۔ ان دنوں مجھے صرف افسانوں سے دلچسپی ہوا کرتی تھی، البتہ مخصوص طرز کا نام ہونے کی وجہ سے ذہن کے ایک گوشے میں کہیں محفوظ رہ گیا تھا۔

دکوہا پہنچتے ہی بھائی جان سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا۔ وہ ان کے پاس ہی تھی۔ چنانچہ سفری بستر کھولتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسے لے کر بیٹھ گیا اور میں نہیں بتا سکتا کہ اس کے مطالعہ کے دوران میری کیا کیفیت ہوئی۔ لسانی مطالعہ اور قلبی تصدیق کی ایسی یکسانی میں نے اس سے پہلے کبھی نہ پائی تھی۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ زبان کے ساتھ دِل اتنی قوت سے ہم آہنگ ہو۔ ہر ہر جملے کے مطالعہ پر یہ کیفیت تھی کہ۔

ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں تھا

یہ مصرع صرف سنتے آئے تھے۔ اس کی لفظ لفظ کی تفسیر اس کتاب کے مطالعے کے دوران سامنے آئی۔ اور پھر محسوس ہوا کہ ایک لمبی مسافت طے کر کے آنے والا مسافر جو مسلسل چلا جا رہا تھا۔ منزل سے بے خبر۔ زادِ راہ سے عاری۔ فاصلوں کی طوالت سے انجان۔ تکان اور اُدھیڑ بُن کا مارا ہوا۔ اُسے کہاں جانا تھا! کدھر جانا تھا؟ وہ کون تھا؟۔ کیوں آیا تھا؟ کیوں جا رہا تھا؟ کتنی کچھ بے اندازہ بے مقصدیت تھی جس نے اس کی زندگی کو گھیر لیا تھا۔ بگولے اس کے آگے تھے۔ بگولے اس کے پیچھے تھے، اس کے دِل۔

دماغ میں تھے۔ اس کے ہم سفر تھے۔ اس کے رفیق و دمساز تھے، اس کی منزل انہیں بگولوں میں کھو کر رہ گئی تھی، اور یہ بگولے اس کے ہیولے تک کو اپنے گرد و غبار میں تحلیل کئے جا رہے تھے۔

پھر اس کتاب کے چند ہی صفحات پڑھ کر وہ مسافر گویا نخلستان میں پہنچ گیا بگولے چھٹ گئے، گرد و غبار بیٹھ گیا۔ پیہم مضطرب دل سکون پذیر ہو گیا۔ دھندلاہٹ چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی گویا۔ کسی نے انگلی تھام لی، اور راہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اچھا یہ ہے وہ اسلام جسے میں بے جانے بوجھے مدت تک مانتا رہا تھا تو گویا اسلام کا بھی کوئی مفہوم ہے گویا چاند سورج، اور ستارے بھی بندگی رب بجا لا کر مسلم ہیں وہ بھی اسی منزل کے مسافر ہیں جس کا میں ہوں۔ مسلمان بھی بامعنی لفظ ہے۔ اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو واضح اور فطری ہیں... آہ کتنی بھاری گم شدگی تھی... اللہ کیسی راہ میسر آئی تھی۔

میں نے اپنی زندگی میں شاید کبھی اتنی مسرت محسوس نہ کی تھی جیسی اس روز محسوس کی جیسے میں کھو گیا تھا اور پھر میں نے اپنے آپ کو پا لیا تھا۔ گویا میرا اونٹ میرا تمام زادِ راہ لے کر جنگل میں کھو گیا تھا۔ فاصلہ دور تھا، پیاس سے حلق میں کانٹے ابھر آئے تھے۔ کہیں پہنچنے کی اب کوئی امید نہ رہ گئی تھی اور مایوسی گھیر رہی تھی، اور میں نے اچانک دیکھا کہ میرا اونٹ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں اتنے ذوق و شوق کے ساتھ آج تک کوئی کتاب نہ پڑھی تھی کہ جس کے بارے میں میرا جی چاہتا ہو کہ کبھی ختم نہ ہو لیکن میں نے اسے ایک ہی نشست میں ختم کر لیا۔ اس کتاب کو میں نے فنگی کے عالم میں پڑھا، خود سپردگی کے عالم میں، کیف و انبساط کے عالم میں منزل

پا لینے کے سرور کے عالم میں ... لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ اس کا لکھنے والا کس دنیا میں تھا۔ کون تھا۔ کیا کر رہا تھا؟ کہاں تھا؟ بس یہ مسرت کہ میں نے اپنے بہت سے سوالات کا جواب پا یا تھا۔ بہت سے خرخشوں کو میرے ذہن میں سکون حاصل ہو گیا تھا۔ اور میرا دل ایک مسلسل اضطراب سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ مسرت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے اس سے زیادہ سوچنے کا اس روز کوئی موقع نہ تھا۔ اسی شام بھائی جان نے مجھے ایک مضمون "تجدد کا پائے چوبیں" سنا یا جس نے میرے ذہن میں نیاز فتح پوری صاحب کے بوئے ہوئے ریب و تذبذب اور تشکیک کے بہت سے کانٹوں کو نکال دیا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ نیاز صاحب کی باتیں بھی لغو ثابت کی جاسکتی ہیں۔

دوسرے دن میں چوہدری صاحب سے ملا۔ ان کے پاس ایسی بہت سی کتب تھیں۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے اور وہ آج بھی سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے درمیان گھڑی کی طرح اپنا ملازمتی جالا بُن رہے ہیں اور آزادیٔ ضمیر کے لئے دن رات اسکیمیں سوچتے رہتے ہیں۔

آہ کتنے آگے ہیں جو پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے پیچھے ہیں جو آگے ہو جائیں گے

الٰہ آباد کے اجتماع میں پہلی بار میں نے ان جملوں کا مفہوم معلوم کیا کہ

• جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالت میں انسان سے نہیں کی جاتی، وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستوں اور خونی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور

موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں۔ ان کے خصائل میں تغیر آ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل وصورت لباس، خوراک اور عام زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔"

اجتماع گاہ میں میرا داخلہ گویا ایک دنیا سے دوسری دنیا میں داخلہ تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز مجھے حیران متعجب اور گرویدہ بنا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا بھی اس دور کے انسانوں سے ممکن ہے؟ کیا ایسے انسان بھی اب تک زمین پر کہیں بستے ہیں؟ کس بے فکری سے میں نے اپنا سوٹ کیس کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ بے فکری سے دوکانوں پر دوکاندار اشیاء چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور ان کا مال قیمت کی فہرست کے مطابق بکتا رہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس خریداری کا تجربہ کیا۔ سگرٹ لینے گیا تھا۔ دوکاندار موجود نہ تھا۔ میں نے قیمت رکھ کر سگرٹ کا ایک پیکٹ اٹھالیا۔ کتنا اعتماد، کتنا سکون، کتنا بھروسہ اس فضا میں گھلا ملا تھا۔

نماز کے وقت بھیڑ تھی اور لوٹے کم تھے، میں اپنی گذشتہ عمر میں تو ایسے موقعوں پر عجیب نفسا نفسی کا عالم دیکھتا آیا تھا۔ چنانچہ وہاں جا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اچانک ایک صاحب نے لوٹا بھر کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں حیرانی سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے ایسی بے نفسی اور اخلاص حیرت کا سامان لئے ہوئے تھا کھانے کے موقع پر اجتماع گاہ میں رپورٹیں پیش کرتے ہوئے اور تجاویز پر بحث کرتے ہوئے سبھی کچھ میرے لئے نرالا تھا۔ اس ماحول میں جب میں داخل ہوا

تو سر سے پاؤں تک میں مغربی تہذیب کا نمونہ تھا۔ مجھے اس ہیئت میں دیکھ کر کسی نے کوئی سرگوشی نہ کی، اور نہ اُبرایا، لیکن اسی شام میرا سارا لباس بدل گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اپنے ہی کارواں کے درمیان پا رہا تھا۔ جانے پہچانے، دُکھ سُکھ کے ساتھیوں اور رفیقوں کا ایک قافلہ اور میں بھی اس قافلے کا ایک مسافر تھا جس نے اپنی منزل کو ان کی منزل سے اور اپنی قسمت کو ان کی قسمتوں سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔

قطرہ تھا جو بے تاب تھا، مدتوں آوارہ ہواؤں کے دوش پر پریشاں خاطر پھرا تھا۔ بالآخر سمندر کے سینے میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں جا ملا تھا۔

(تصویریں)

(۱۹۵۲ء)

راکھ کے ڈھیر

ناخدا ترسی ۔ بے یقینی اور مادہ پرستی نے ابنِ آدم کو کیا سے کیا بنادیا ہے ۔ بالکل راکھ کے ڈھیر

نفرت ۔ بغض ۔ عداوت ۔ جنگ وجدل ۔ تباہی اور بربادی اس کے روزمرہ کے معمول بن گئے ہیں ۔

آہ کوئی ان بے جان راکھ کے ڈھیروں اور بھڑکتی ہوئی چتاؤں کو دیکھے جو انسانوں نے اپنے کمالِ انسانیت کے مظاہرے کے طور پر بھڑکائی ہیں ۔ جن کی تہ میں جُھلسے ہوئے ڈھانچے ۔ اجل گرفتہ اجسام اور تباہ شدہ انسانیت کے اعضاء مدفون ہیں ۔ یہ وہ تحفے ہیں جو ہمسایوں نے ہمسایوں کو ۔ بھائیوں نے بھائیوں کو اور دوستوں نے دوستوں کو پیش کئے ہیں ۔ بارگاہِ انسانیت میں یہ کتنے بیش بہا تحائف ہیں ۔ بربادی بے چارگی ۔ زخم

آہیں۔ اور غیض و غضب۔ یہ بیش بہا تحائف بادہ پرستی اور ناخدا ترسی دورِ حاضر کے ابنِ آدم کے حضور میں لائی ہے۔

آہ، کوئی ان چلتے پھرتے راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے۔ جن کے نیچے شرافت و انسانی ہمدردی۔ اخلاق اور خدا خوفی۔ سوختہ حالت میں مدفون ہیں جن کے سینوں میں بغض و عداوت۔ اخلاقی پستی ظلم اور ناخدا ترسی کی چنگاریاں سُلگ رہی ہیں پستیاں جن کے کثیف شعلوں سے الامان و الحفیظ پکار اٹھی ہیں۔ ہلاکت و درندگی جن کے تپتے ہوئے سینوں میں سانس لے رہی ہیں۔ طبقوں اور فرقوں کی عداوتوں نے انہیں جہنم کی بھٹیاں بنا دیا ہے اور تباہی و بربادی ان کی رفیق ہیں۔ نہ یتیم کے آنسو ان کی آنکھوں میں نمی پیدا کر سکتے ہیں۔ نہ بیواؤں کی آہیں ان کے دلوں کی تپش بجھا سکتی ہیں۔ نہ مظلوموں کی آہ و زاری ان کے دلوں میں عبرت کی لہر دوڑاتی ہے اور نہ ضعیفوں کی بے چارگی ان کے مہلک ارادوں کو تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ انسان کہلانے والے دو پائے چلتے پھرتے راکھ کے ڈھیر ہیں جو ابنِ آدم کی ہر صفت سے عاری ہیں۔

آہ! کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جن کے سینوں کی چنگاری نے قوموں کو بھسم کر دیا ہے۔ جن کی سانسوں میں تنور کی لپٹیں ہیں۔ جن کے الفاظ آتشیں تیر ہیں جو دنیا کی قیادت کی شہ نشینوں پر بیٹھ کر دنیا کے اطراف و جوانب میں امن و سلامتی کی بجائے آگ چھڑکتے ہیں جو ارضی جہنموں کے داروغے ہیں جن کے صوفوں کی نرمی میں کسی بے گناہ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی بھی کمی نہیں کر سکتی۔ جن کی کاروں کی رفتار کو لڑھکتا

ہوا کا سئلہ سر بھی سُست نہیں کر سکتا جن کی سوزناک آتشیں تقریروں اور بیانوں کی تلخی کو کسی بے گناہ کی چیخ کسی مظلوم کا نالہ۔ کسی بے بس کی پکار اور کسی معصوم کی آہ بھی بدل نہیں سکتی۔ جن کے دلوں میں جہنم کی آگ کی لپٹیں ہیں جن کا تختِ طاؤس انسانی کھوپڑیوں پر کھڑا ہے اور جن کا راہوار انسانی خون میں تیر نا پسند کرتا ہے۔ جن کا وقار ہر آہ۔ تڑپ اور ٹیس کے احساس سے بلند ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے یوں پھڑواتے ہیں جیسے روم کے قیصر درندوں سے پھڑوایا کرتے تھے جو اپنی راہنمائی میں نیرو اور ہلاکو ہیں۔

آہ کوئی راکھ کے ان ڈھیروں کو دیکھے جو شہدا علی الناس کا خطاب پاکر اس دنیا میں آئے تھے جو فساد فی الارض کو دُور کرنے والے گردانے گئے تھے۔ جو انسانوں کو انسانیت۔ ہمسایوں کو ہمسائیگی۔ دوستوں کو دوستی۔ بھائیوں کو اخوت اور والدین کو شفقت و رحمت سکھانے آئے تھے جو دنیا میں انسانیت کا نمونہ بن کر آئے تھے دیانت اور سچائی جن کی خصلت تھی۔ رحم اور ہمدردی جن کی فطرت تھی۔ محبت و یگانگت جن کے یمین و یسار چلتی تھیں اور عدل و انصاف جن کی گھٹی میں ڈالے گئے تھے جو ابنِ آدم کو گمراہی کی ہلاکتوں سے نجات دینے آئے تھے۔ ان کے گمراہ سروں کو ہر ذلت و مسکنت سے اٹھا کر ایک ہی درگاہِ عالی میں جھکانے آئے تھے جو نسل و خون کے ماروں کو، قوم و وطن کے ہلاکت زدوں کو آباؤ اجداد کے پامالوں کو، اور اوہام و اباطل کے پرستاروں کو ان تمام رُسوا کن پھندوں سے نکال کر ایک بلند انسانی سطح پر بٹھانے آئے تھے۔ ہاں کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو

دیکھے جن کے پاؤں اب ہر ایسی زنجیر میں گرفتار ہیں جن سے انہوں نے بنی نوع انسان کو چھڑایا تھا۔ جو فساد کو مٹاتے آئے تھے وہ سر سے پا تک فساد میں لتھڑ گئے ہیں جو نسل و خون اور قوم و وطن کی بندگی سے دوسروں کو چھڑاتے آ رہے تھے۔ وہ خود ہلاک جادوئے سامری اور قتیلِ شیوۂ آذری ہیں جن کے ہاتھوں میں مشعلِ ہدایت دی گئی تھی وہ آتشیں شعلے لے کر دنیا کو پھونکنے چلے ہیں۔ جو بندگی کا عہد کر کے آئے تھے ان میں نمرودیت اور فرعونیت انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آہ کوئی ان حق کی شہادت دینے والوں کو دیکھے۔ جن کی راہیں کہیں معاشی بدحالی نے مسدود کر رکھی ہیں اور کہیں معاشی خوشحالی نے۔ طائف کی گلیوں میں پتھر کھانے والے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کا دعوے کرنے والوں کو لوگوں کی کم توجہی کا شکوہ ہے۔ کوئی ان نوحؑ۔ لوطؑ۔ ابراہیمؑ اور محمد علیہم السلام کے پیروؤں کو دیکھے۔ جنہیں لوگوں کی بے حسی اور لاپرواہی فریضۂ حق ادا کرنے سے روکتی ہے۔ جن کی جیبیں خوفِ انفاقِ مال سے بھنچ جاتی ہیں جن کی زبانیں خوفِ ملامت سے گنگ ہو گئی ہیں۔ جن کے قدم [illegible] پھر رہے ہیں۔ جن کی آنکھیں مصائب کی آندھی سے پتھرائی جا رہی ہیں۔ باطل کی امنڈ امنڈ کر آنے والی لہروں سے جن کے قلوب سینوں میں گھٹ گھٹ گئے ہیں اور جن کی عقلیں راہِ حق کی مشکلات سے حیران و ششدر ہیں۔

آہ کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جو صدیقی و فاروقی و عثمانی و علوی کے لیبل لگائے ہوئے ہیں اور جو یوں سرد ہو گئے ہیں جیسے منہدم قبریں ہوں یا جیسے زمین نے لاشے اگل دیئے ہوں۔ جیسے اہرامِ مصر کی ممیاں ہوں یا جیسے بت خانوں کے

بے جان و بے رُوح مجسمے ہوں۔

آہ کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جن کے چاروں طرف خُونیں مناظر ہیں اور دنیا ہلاکت و بربادی اور گمراہی و ذلت میں جکڑ گئی ہے۔ اور ان کی بصارت سلب ہو گئی ہے۔ جن کے اردگرد کراہوں پہ چیخیں۔ آہوں اور زاریوں کا ایک طوفان ہے اور ان کی سماعتیں اچک لی گئی ہیں۔ خون اور لاشیں۔ خدا سے بغاوت اور ظلم و زیادتی ان کے اوپر اور نیچے ہیں۔ اور ان کی کمر کی ہمت انہیں جواب دے گئی ہے۔ جو رخصت کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ جن کے استقلال و برداشت کی وسعت خدا کی راہ میں کسی تکلیف کے لئے بے انتہا تنگ ہو گئی ہے جو امنڈتے ہوئے باطل کے سیل کو دیکھ کر خانقاہوں کے تنگ گوشوں میں چھپ جانا چاہتے ہیں اور اپنی عافیت گاہوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کی تاویلوں کے دبیز پردے ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ باطل کی قوت و شوکت سے ذلیل مصالحت جن کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہی ہے۔ آہ کوئی انہیں جگائے اور بتائے کہ تم اپنے خدا کو کیسے دھوکا دے سکتے ہو۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے یقینِ آخرت کو دیمک کیوں کھا گئی ہے۔ تم اپنے فریضۂ حق سے منہ موڑ کر کس درگاہ سے سرخروئی اور نجات کی توقع رکھتے ہو۔ کیا اس عدالت کو بھی دنیا کی کوئی بے نور عدالت سمجھ لیا ہے کہ تمہارے ضمیروں کی بجائے تمہاری لفظی اور قانونی موشگافیوں پر فیصلوں کا انحصار ہوگا۔ تم اپنی ردِ گردانیوں کا تحفہ حضورِ حق میں کس منہ سے پیش کروگے۔ دیکھو کہ وہ راہِ حق پھر تم پر واضح کی جا رہی ہے۔ سنو کہ وہ بھولا ہوا سبق پھر کسی نے دہرایا ہے۔ اٹھو کہ وہ قافلہ پھر اپنی منزل

کی طرف چل پڑا ہے جس کے تم مسافر کہلاتے ہو۔

آج تم پر حجت تمام ہوئی جاتی ہے اور تمہیں آزمائش کی ترازو میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ تم نہ اٹھو گے تو قافلہ چلتا رہے گا۔ لیکن تم اس منزل سے محروم رہ جاؤ گے جس منزل کے تم مسافر کہلاتے ہو۔

(للکار)

(۱۹۴۶ء)

آزادی کا ماتم

یہ پندرہ اگست ہے۔ آج ایک قوم کو اچانک میدانِ آزمائش میں دھکیل دیا گیا تھا
آج اس قوم کو جس نے برسوں سے شور مچا رکھا تھا کہ ہم نے اپنا آموختہ یاد کر لیا ہے،
اچانک اپنا سبق سنانے کے لئے کہہ دیا گیا تھا۔ آج لیکایک اس طالب علم کو امتحان کے
کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جو مدت سے اپنی قابلیت اور اہلیت کا اشتہار دے رہا تھا۔
آج اچانک اس قلاش کے دامن میں ایک بھاری امانت ڈال دی گئی تھی جس نے برسوں
سے اپنی دیانت داری کا اعلان کر رکھا تھا۔ آج لیکایک اس کشتی کے پتوار ان ناخداؤں
کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے تھے۔ جنہوں نے مدت سے شور مچا رکھا تھا۔ کہ ان کی منزلِ
مقصود آزادی حرّیت اور تہذیبی استقلال ہے جن کی زبانوں پر اسلام کا لفظ بار بار آتا
تھا۔ جن کے حلق اسلامی نظام کے نعروں سے خشک رہتے تھے۔ جنہوں نے گلی گلی وعدے

بکھیر رکھے تھے۔ جنہوں نے کوچہ کوچہ اپنے عہد و پیمان کا اعلان کر رکھا تھا۔ جنہوں نے اسلام کو ایک فریقِ جنگ بنا رکھا تھا۔ آج کے دن یکایک ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور امتحان گاہِ زمانہ میں اپنے وعدوں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیئے لاؤ۔ آج کا دن آزمائش میں داخلے کا پہلا دن تھا۔ اور اس داخلے کے لیئے قوم نے کتنی بھاری فیس ادا کی تھی۔ قوم کے نصف کو گروی رکھا گیا تھا۔ قوم نے اپنے معصوموں کی مسکراہٹوں کو بیچا تھا۔ اپنے بوڑھوں کے وقار کو نیلام کیا تھا۔ اپنے جوانوں کی خودداری اور قوت بھینٹ چڑھائی تھی۔ اپنی عزتوں اور عصمتوں کے موتی لٹائے تھے۔ اپنی تاریخ کا ہزار سالہ ریکارڈ کباڑ خانے کی نذر کیا تھا۔ اپنے مُردوں کے ڈھانچے اکھڑوائے تھے۔ اپنے زندوں کے لاشے ڈھیروں ڈھیر دیئے تھے۔ اپنی مساجد کا سہاگ لٹایا تھا۔ اپنے میناروں کو وقفِ ماتم کیا تھا۔ اپنی نصف ہی رُوح بیچی تھی۔ تب اسے یہ داخلہ ملا تھا کہ وہ آکر اپنے وعدوں کا امتحان دے۔ اس امتحان کا نتیجہ آج تک زمانے کے سینے پر نمودار نہیں ہوا۔ شاید وہ سب کچھ راوی اور بیاس کے خونیں پانی میں ہی بہہ گیا۔

یہ پندرہ اگست ہے۔ یہ دن دانتوں میں انگلی لیئے حیران و متعجب کھڑا ہے کہ یہ قوم جو اپنے محبوب کے نصب العین کے لیئے غلامی کی حالت میں بھی اپنے وجودِ معنوی و مادی کو قربانی کے تختے پر لیئے کھڑی تھی۔ آج آزادی کی حالت میں اس محبوب کی طرف سے اتنی بے حس کیوں ہے؟! جو غلامی کے قفس میں اس کے بغیر تڑپتی تھی۔ اب آزاد ہو کر اس سے کیوں غافل ہو گئی ہے۔ جس مسافر نے رات کی تاریکیوں میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیئے سر تیغ پٹخ دیا تھا۔ اب طلوعِ سحر پر منزل کی طرف سے

بے خبر دنیا کے دوراہے پر کیوں سویا پڑا ہے۔

یہ کیسا مجاہد ہے جس نے تلوار کے حصول کے لئے دن رات ایک کر دیئے اور جب تلوار حاصل ہو گئی تو میدانِ جہاد سے فرار کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ کیسا عشق ہے جو محبوب کے کوچے میں آکر ہی سرد پڑ گیا ہے۔ یہ کیسا جوشِ جہاد ہے جو ہتھیار ملتے ہی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ پندرہ اگست کا دن حیران و ششدر کھڑا ہے اور دیکھتا ہے کہ جس راہ کے کانٹے اس مسافر کے لئے پھول تھے۔ اس راہ کے پھول چننے کے لئے اس مسافر نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ حقیقت کی اس تلخ تعبیر پر اسے سکتہ سا ہو گیا ہے۔

یہ پندرہ اگست کا دن ہے۔ یہ دن واگہ پار کے باشندوں کو یاد دلاتا ہے کہ تم اپنے دعووں میں جھوٹے نکلے۔ تم نے دعوے کئے تھے کہ یہاں کے باشندے سب ایک ہی قوم ہیں۔ اس اصول کا دُور دُور تک ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ اس کے لئے ایک پوری تحریک چلائی تھی اور نصف صدی تک تمہارے بہترین افراد اس اصول کا اعلان اپنی زندگی اور اپنی موت کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ تم اس اصول پر ایمان رکھتے تھے اور اس ایمان سے ہٹ جانا تمہارے لئے ممکن نہ تھا لیکن حالات کے ایک پلٹے کے ساتھ ہی تم نے اپنے اس محبوب اصول کو یوں پھینک دیا جیسے کوئی بچہ اپنا ٹوٹا ہوا کھلونا پھینک دیتا ہے۔

تم نے اپنے عمل سے۔ اپنی زبان سے۔ اپنی تلوار سے۔ بندوقوں سے۔ برچھیوں نیزوں اور بھالوں کی زبان سے کہلوایا کہ جن لوگوں کو تم اصولی طور پر اپنی قوم کا ایک جزو کہتے تھے۔ حقیقت میں تمہارے دل اپنے اس اصول کو خود جھٹلاتے تھے۔ تم

نے ان کی عزتیں لوٹیں۔ ان کے گھر لوٹے۔ ان کو تباہ و برباد کیا۔ ان کا خون پانی سمجھ کر بہا دیا۔ حالانکہ کوئی قوم اپنی قوم کے افراد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی۔ یہ دن تم سے کہنے آیا ہے کہ تم جھوٹے تھے اور تم نے نصف صدی تک جس بات پر ایمان رکھا اسے ایک دن میں غلط ثابت کر دیا۔ آزادی کی جس تلوار کو تم ملک کے ہر طبقے کے لئے رحمت کہا کرتے تھے اسے پاتے ہی تم کمزوروں کو ذبح کرنے کے لئے لپک پڑے۔ تاکہ سب سے پہلے اس کی تیزی انہیں پر آزماؤ۔ جو آزادی تم انسانیت کے فروغ اور اچھائی اور بھلائی کی اشاعت کے لئے لینا چاہتے تھے۔ وہ آزادی تم نے انسان کشی اور مردم آزاری پر استعمال کی۔ تم میں جو بین الاقوامیت کے علمبردار تھے وہ اوّل درجہ کے فرقہ پرست نکلے۔ تم میں جو اتحاد کے بڑے دعویدار تھے۔ وہ اوّل درجے کے فسادی اور موذی نکلے۔ تم نے بہت جلد پوری دنیا کے سامنے یہ شہادت دے دی کہ سیاسی آزادی نے ایک انسان کے بندِ غلامی نہیں کھولے بلکہ ایک درندے کا پنجرہ کھول دیا ہے۔ آج کا یہ دن برِّ صغیر کے لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ ان کی آزادی کا مقصد خلقِ آزاری نہیں بلکہ خلق پروری تھا۔ تعصّب کا فروغ نہیں بلکہ اس کا خاتمہ تھا۔ یہ دن ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ درندگی چھوڑ دیں اور انسانیت کو ابھاریں اور دنیا کے ممالک میں ایک بہتر یا اخلاق صلح پسند ملک کا اضافہ کریں۔ وہ رام کا وطن ہے جو عہد کا پکّا تھا۔ وہ لچھمن کا وطن ہے جو اپنے بھائی کا بہت خیر خواہ تھا۔ وہ گوتم کا وطن ہے جو ظلم نہیں کرتا تھا۔ وہ کرشن کا وطن ہے جو سداما جیسے غریب دوست کی عزّت افزائی کر سکتا تھا اور جس کا پیغام ظلم کی مخالفت اور حق کی حمایت تھا وہ اشوک کا وطن ہے جو طاقت کے باوجود رحمدل تھا۔ وہ ارجن کا وطن ہے جو فراخدل

تھا۔ کیا اب وہ ان لوگوں کا ملک بن جانے گا جو دنیا کے ! ملتیے اور تاریخ کے صفحات
میں بے گناہوں کو قتل کرنے والے۔ کمزوروں پر ظلم کرنے والے۔ بے اختیاروں پر
بے جا اختیار استعمال کرنے والے۔ بچوں پر ہاتھ اٹھانے والے۔ عورتوں اور بوڑھوں کو
ذلیل کرنے والے ٹھہرائے جائیں گے۔ اگر وہ اپنے ملک کو یوں بنانا چاہتے ہیں تو یہ
آزادی کا دن ان کی اس آزادی پر ماتم کرتا ہے۔

(ڈپکار)

سنہ ۱۹۴۷ء

لاشوں کے انبار

اے لوگو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہو اور خاموش رہتے ہو!
کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا۔ تمہارا اسلام خطرے میں ہے۔ آؤ ہماری طرف کہ ہم تمہیں ایک جنت میں لے چلیں۔ جہاں ایمان کے باغات ہوں گے۔ دیانت اور عدل کے پھل ہوں گے اور اطاعت خداوندی کے زعفران سے ساری فضا مہک رہی ہوگی تم ان کے پیچھے یوں لپک گئے جیسے ایک پالتو گھوڑا اپنے مالک کے ہاتھ میں ہری گھاس کی چند پتیاں دیکھ کر لپک پڑتا ہے۔
اے لوگو یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تمہاری عقلوں اور بصیرتوں کو دیمک لگ گئی ہے۔ تم نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی کہ اپنی طرف بلانے والوں کے پھول کاغذی تھے وہ خوبصورت تھے لیکن ان میں وفاداری اور ایفائے عہد کی خوشبو نہ تھی ان کے اپنے

طور و اطوار میں اسلام کے خادموں کا نہیں بلکہ کفر کے پیرؤں کا رنگ تھا۔ ان کی سیرت کی کھیتی میں ایمان کی زعفران نہ تھی۔ ان کے اخلاق کے باغیچوں میں اطاعتِ خداوندی کا ایک پودا بھی نہ تھا۔

اے لوگو! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ دیکھا اور پھر بھی گردنیں ان کے ہاتھوں میں دے دیں اور چُپ چاپ ان کے اقتدار کی گاڑی میں جُت گئے۔

یہ تم کہاں بہکے چلے جا رہے ہو۔

تم نے جن لوگوں کے وعدوں کی کھیتی اپنے خون سے سینچی تھی کہ وہاں اسلام کا پودا اُگے گا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اس بنجر زمین میں کیا اُگا۔

یہ اسلامی سوشلزم کی خودرو جھاڑیاں اسلامی اشتراکیت کے خاردار پودے مغربی جمہوریت کی مکروہ گھاس بے دینی و الحاد کے کانٹے اور فتنۂ ثقافت کے جھاڑ جھنکار کے سوا وہاں کچھ بھی نہ اُگ سکا۔ تمہارے خون کے معاوضے میں تمہیں اللہ کی خوشنودی سے محروم کر دیا گیا ہے اور شیطان کے غلیظ جال تمہارے چاروں طرف بکھیر دیئے گئے۔ لیکن تم ہو کہ دم بخود پڑے ہو! یہ کیا ہے کہ تمہارے احساسِ ایمانی کی ساری رگیں کٹ گئی ہیں۔

ایک شخص ملک کے ایک گوشے سے دوڑا ہوا آیا اور اس نے سرِ بازار چیخ چیخ کر کہا کہ اے لوگو اپنے رب کی طرف آؤ کہ وہی تمہارا مالک و خالق ہے۔ اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ اسی کا قانون تمہاری زندگی کا قانون ہونا چاہیئے۔ یہ مغربی سیاست کے بت جو تم نے تراش رکھے ہیں۔ یہ تمہیں کہیں کا نہ چھوڑیں گے۔ اگر تمہارے اگلوں نے غلطی کی تو کیا تم بھی اسی غلط راہ پر گردن جھکائے بگٹٹ چلے جاؤ گے۔ آؤ اور خدا کی

رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔"

کہنے والا کہتا رہا لیکن تم نے بے حسی کے پنبے اپنے کانوں میں دے لئے اور ناسمجھی کی پٹی آنکھوں پر باندھے ہوئے تم اپنے خدا کی مرضی سے دُور ہٹ گئے۔

اے لوگو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ہر راہ پر چل پڑتے ہو اور ایک خدا کی راہ ہی ہے جس پر تمہارے پاؤں من من بوجھل ہو جاتے ہیں۔

کیا تم اپنا فرض کبھی نہ پہچانو گے؟ کیا تم یونہی خدا کی نافرمانی کی سڑک ہموار کرنے والے مزدور بنے رہو گے؟ کیا حق کی مظلومیت تمہارے سینوں کو کبھی نہ گرمائے گی: کیا باطل کی شوکت کی گاڑی میں تم یونہی جُتتے رہو گے؟

خدا کے بندو کیا تم بھول گئے ہو کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان صرف اللہ کا کلمہ ہی بلند کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا ہے۔ اے لوگو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کے باغی تمہارے کندھوں پر سوار ہیں اور تمہارے سینوں میں ایک ٹیس بھی بیدار نہیں ہوتی۔ کیا تم یونہی لاشوں کی طرح پڑے رہو گے۔ یہاں تک کہ ابلیس تمہیں اٹھا کر اپنے فتراک میں ڈال لے۔ اللہ کے بندو تم تو بالکل ہی لاشوں کے انبار بن کر رہ گئے ہو۔

(پکار)

۱۹۵۰ء

میرا دِل چاہتا ہے

تلخ و تند جذبوں اور تیز و بے باک ولولوں کا ایک ریلہ ہے کہ بارہا میں نے دِل و دماغ کی وسعتوں میں گردش کرتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ کتنی ہی ان کہی باتوں کے قافلے میں نے دل کی وادیوں میں پریشان پائے ہیں اور کتنے ہی جانباز اور جری خیالات میں نے ذہن کی تنگناؤں میں گردش کرتے ہوئے محسوس کئے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی شوخ و سبکسار جذبے نے چاہا کہ میرے شعور کی آنکھ بچا کر زبان کی راہ سے نکل جائے یا قلم سے چھوٹ کر ٹپک جائے۔ لیکن میں نے اسے ہمیشہ روکا ہے اور خیالات پر اپنی احتسابی گرفت ہمیشہ مضبوط رکھی ہے تاکہ کوئی سرکش خیال دِل و دماغ کے قید خانے سے نکل نہ بھاگے۔ لاتعداد ہی جذبے ہوں گے اور بے شمار ہی ولولے ہوں گے جنہیں میں نے مدتوں نظر بند رکھا ہے اور وہ قلب و ذہن میں مدتوں دھوئیں مچاتے رہے ہیں۔

بارہا میرا دل چاہا ہے کہ ان جذبات کو الفاظ کے لباس پہنا پہنا کر دنیا سے نیست و بود میں آجانے دوں اور بارہا یہ سوچ کر خاموش ہو گیا ہوں کہ اس رزمگاہ میں ایسے کھلاڑی اُتر آئے ہیں جو شجاعت کی رُوح سے اتنے ہی عاری ہیں جتنے ان کے دل عیش و آرام کی تمنا سے بھرپور ہیں۔ ایسے نازک آبگینوں کو تو کسی نوکیلے لفظ کی ایک چبھن بھی رُلا سکتی ہے۔ یہ بھلا کسی تلخ نوائی کے کیا حریف ہوں گے لیکن میرا دل ضرور چاہا کرتا ہے کہ کچھ کہوں اور اتنا چیخ چیخ کر کہوں کہ بہرے بھی میری آواز کو پُوری طرح سُن لیں اور وہ بھی جنہوں نے حق کی طرف سے اپنی بصیرت کے کانوں میں انگلیاں دے رکھی ہیں۔

بارہا میرا دل چاہا ہے کہ اس ملک کے حاکمِ اعلیٰ سے کہوں کہ اے خدا سے متعلق کے عاجز بندے جس دین کا تو نام لیوا ہے۔ اس کے پیروؤں میں تو ان بندگانِ خدا سے ضرور واقف ہوگا جنہیں تاریخ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ذمہ داری کے لحاظ سے بھی تو اسی مقام پر کھڑا ہے جس پر وہ مقدس ہستیاں تھیں جو تاریخ کے دامن میں اپنی آب و تاب کے لحاظ سے بیش بہا موتی تھے جنہیں خدا نے اپنے لاکھوں بندوں پر اقتدار دیا تو انہوں نے کس طرح اپنے اختیارات کو استعمال کیا تھا۔ کس طرح ذمہ داری کے احساس سے ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ کس طرح انصاف اور اخوت و مساوات میں انہوں نے انسانی تاریخ میں اپنی مثالیں قائم کر دی تھیں۔ کس طرح بڑی سے بڑی فتح کے موقع پر بھی انہوں نے غلاموں کو اونٹوں پر بٹھا کر اور خود اونٹ کی نکیل تھام کر ثابت کر دیا تھا کہ اصل شوکت اخلاق اور تقوے کی ہے۔

نہ کہ شاہانہ حشمت اور بناوٹی شان و شکوہ کی کس طرح انہوں نے بھرے مجمعوں میں اکھڑ ملے اکھڑ اعرابیوں کے سخت سے سخت اعتراضات کا پوری نرم دلی سے جواب دیا تھا۔ کس طرح صداقت اور سچائی کی روح کو انہوں نے یہ کہہ کر فروغ دیا تھا کہ جب تک ہمارے درمیان ایسے حق گو لوگ موجود ہیں۔ ہمیں امتِ مسلمہ میں فساد کا خطرہ نہیں ہے۔ اور کس طرح بے لاگ تنقید کے موقعوں پر انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اگر یہ لوگ حق بات بے لاگ ہمارے منہ پر نہ کہیں تو ان میں خیر نہیں اور اگر ہم حق بات کو سکونِ قلب سے نہ سنیں تو ہم میں خیر نہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے علماءِ سُو سے بھی مؤدبانہ گذارش کروں کہ اے منبرِ رسولؐ پر قابض بزرگو۔ اور اے اُمتِ مسلمہ کی رہنمائی کے مدعیو۔ یہ دین کے منبر کو چھوڑ کر دنیا پرستوں کی کاروں کے پیچھے دوڑنے میں تم اتنے بادپا کیوں ہو گئے ہو۔ کوئی غرض پرست ایسا نہیں رہا جس نے اپنے اعمالِ قبیحہ کے جواز کے لیئے تم میں سے کسی نہ کسی کو دینِ قیّم کا اتہزاد کرنے کے لیئے مامور نہ کر رکھا ہو۔ تم جو امام ابو حنیفہؒ کی پیروی میں سعادت سمجھتے ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو بادشاہوں کے درباروں میں بھی جانا حرام سمجھتے تھے۔ تم جو احمد بن حنبلؒ کے مدح خوان ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لیئے برس ہا برس تک کوڑے کھا سکتے اور جابر بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر جیل جا سکتے تھے۔ تم جو امام مالکؒ کے معترف ہو جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لیۓ سخت سے سخت اذیت سہہ سکتے تھے۔ تم نے تو امام شافعیؒ کی حق پرستی کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ تم نے تو امام حسینؓ کے جذبۂ قربانی کو بھی سرِ بازار رسوا کر دیا۔

بس تم سے کیا کہوں کہ تم نے ہر قدم پر اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکام سنائے اور

پھر ہر قدم پر انہیں احکام سے چشم پوشی کی۔ تم نے شاہوں کو للکارا اور انہیں کے ہاتھوں بک گئے۔ تم نے حق کی پشت پناہی کی اور اسے ہی پیٹھ دکھا گئے۔ جب بھی باطل نے مصالحت اور مکروفریب کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھایا تم نے ہمیشہ بصیرتِ مومن کو بالائے طاق رکھ کر اسے چوم لیا۔ بلخ بخارا اور سمرقند جہاں سے امام بخاریؒ جیسے بزرگانِ دین اٹھے اور جہاں صدیوں اسلام سربلند رہا وہاں تم نے دہریوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں خود اپنے ہتھیار دیئے اور جب انہوں نے تمہاری ایک ایک گردن سے خون بہا دیا اور تمہاری مساجد کے ہر مینار پر لکھ دیا کہ "آج سے یہاں مذہب کا نام بلند نہ ہوگا" تو پھر تمہیں معلوم ہوا کہ تم نے اپنی ہی تلواروں سے اپنے گلے کاٹے تھے۔ تم نے ترکی میں ان لوگوں کو قوت دی جو اسلام سے بیزار تھے اور جب انہوں نے وہ سب کچھ جو اسلام کا تھا اتار کر پھینک دیا اور وہ سب کچھ جو مغرب کی دہریت کا تھا اوڑھ لیا تو تمہیں ہوش آیا کہ تم نے اسلام ہی کا مورچہ اکھاڑ پھینکا تھا۔

آج تم پھر آزمائش میں پڑ گئے ہو۔ آج وقت تم سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنے حجروں سے نکلو اور اپنے ملک کے معاشرے کو اسلام کے لئے تیار کرو۔ اگر یہاں بھی تم نے اپنی تاریخِ کہنہ کو دہرایا اور اسلام کے خلاف کفر و الحاد کے ہاتھ میں اپنے فتوؤں کی تلواریں تھما دیں تو کیا تم بتا سکو گے کہ اسلام کے مورچے کو اس سرزمین سے کبھی اکھاڑنے کے بعد تم نے کس زمین کے سینے پر اور کس آسمان کے تلے اپنی پناہ گاہ تلاش کر رکھی ہے

میرا دل چاہتا ہے کہ اس ملک کے دانشوروں، خطیبوں اور صحافیوں سے بھی عرض کروں کہ تم نے مسندِ حلم و دانش کا پروقار مقام چھوڑ کر درباریوں کا کام کیوں سنبھال لیا ہے۔

کوئی دن نہیں جاتا کہ تم کسی اقتدار پسند کے اشارے پر ششکارے جاتے ہو اور سوسائٹی
میں سے چن چن کر ہر اس شخص کی پگڑی اُچھالتے نظر آتے ہو جو تمہیں شریف اور حق گو
نظر آتا ہے۔ علم کا کام انسان کو تذبذب اور شکوک کی دھندلاہٹ سے حق کی چمک اور
وضاحت کی طرف لے جانا ہے لیکن یہ علم تمہیں کس کتاب کا حاصل ہوا ہے جو تمہیں
ہر بھاری جیب کے پیچھے دوڑا دیتا ہے اور ہر اونچے تخت کے سامنے دست بستہ
لا کھڑا کرتا ہے۔ تمہارا قلم اور تمہاری زبان تو خدا کی امانتیں ہیں جنہیں خدا ہی کی راہ میں
اسی کا کلمہ بلند کرنے کے لئے چلنا چاہیئے اس لئے کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت
یہی ہے کہ خدا ہی اس کائنات کا مالک، خالق، آقا، حاکم اور مدبّر ہے۔ بندوں کا تو
کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کی رضا پر اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ اس نے اپنے
دوسرے بندوں کی نسبت تمہیں گویائی اور قلم کی قوتیں زائد عطا فرمائی ہیں، چاہیئے تو یہ
تھا کہ تم اسی نسبت سے ان قوتوں کو خدا کی راہ میں صرف کرتے جس نسبت سے اس
نے تمہیں دوسروں کی نسبت یہ زیادہ دی ہیں۔ لیکن اخباروں کے کالم، کتابوں کے
صفحے اور جلسوں کے پلیٹ فارم گواہ ہیں کہ تم نے اپنے قلم کا لفظ لفظ خدا کی مرضی
کے خلاف اور اپنی زبان کا حرف حرف خدا کی منشاء کے خلاف صرف کر ڈالا ہے
جو خدا کا بندہ بھی اپنا فرض پہچانتے ہوئے اپنا حقِ عبودیت ادا کرنا چاہا ہے۔ تم قلم کے
لٹھ اور زبان کے بھالے لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہو اور جو اقتدار پسند اور
نفس پرست تمہیں اپنی اغراض کا خادم بنانا چاہتے تم فوراً اپنی خدمات اس
کے سامنے پیش کر دیتے ہو۔

تم نے ان لوگوں کے بے شمار قصیدے لکھے جن کی ذات سے الفاظ کا پردہ ناموس

بھی چاک ہوتا تھا اور تم نے ان لوگوں کو مطعون و معتوب کیا جن کی عصمت و پاکیزگی اور خلوص اور دیانت داری پر ان کے دشمنوں کا دل بھی چپکے چپکے گواہی دیتا رہا۔ افسوس کہ زمانے کے چوراہے پر تم نے اپنی پیشانیاں اپنے ہی ہاتھوں سے ذلت کی چوکھٹ پر رگڑ دیں۔ اور تمہارے ضمیر نے تمہیں ایک چٹکی تک نہ لی۔ تم نے اپنے ہاتھوں اپنی کلاہِ وقار نوچ کر کباڑ خانے میں ڈال دی اور تمہاری حمیت نے ایک سسکی تک نہ لی۔

پُکار

سنہ ۴۹ء

انتظار، انتظار، انتظار

صدیوں سے انتظار ہو رہا ہے۔

صدیوں سے انتظار ہو رہا ہے لیکن اس کے رُوئے زیبا کے دیدار سے خلقِ خدا محروم ہے۔ گزشتہ رُبع صدی سے میں انتظار کر رہا ہوں۔ جب سے میرے مقدر نے آنکھ کھولی ہے آنکھیں زمانے کی چوکھٹ پر لگی رہی ہیں۔ کہ کب وہ محبوبِ زمانہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ امیدیں بندھیں اور ٹوٹ ٹوٹ گئیں۔ پاؤں کی دھمک عالمِ خیال میں گونج گونج کر کھو گئی۔ زبان مرحبا اھلاً وسھلاً کہنے کے لئے مضطرب ہو ہو گئی۔ لیکن انتظار جاری ہی رہا۔ وہ نہ آیا۔

میرے والد نے بھی اپنی ساری عمر اس کے انتظار میں گزار دی۔ اب وہ مایوس ہو کر قبر کے کنارے بیٹھ گئے ہیں۔ پاؤں اندر لٹکا دیئے ہیں۔ لیکن نظریں اب بھی اُفق پر

ابھرتی ہوئی گردنیں سے کسی روشن جبیں شہسوار کا مکھڑا دیکھنے کی منتظر ہیں۔ ساری عمر گزر گئی۔ سیاہ بال سفید ہو گئے۔ سیدھی کمر جھک گئی۔ روشن نگاہیں ماند پڑ گئیں مضبوط قدم ڈگمگانے لگے۔ کڑکتی ہوئی آواز تھرتھرا گئی۔ اب وہ مایوس ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں اب وہ نہیں آئے گا۔ وہ شائد کبھی نہ آئے۔" میں کہتا ہوں: "ابا جان وہ ضرور آئے گا۔ وہ زبانِ مقدس جس پر حق جاری تھا۔ جس پر وحی نازل ہوئی تھی۔ جس کا مالک سے براہِ راست تعلق تھا۔ اس نے جو کہا تھا کہ وہ آئے گا۔ اسے ضرور آنا ہے۔ وہ آ کر رہے گا۔ وہ ایک دور کے دَور میں پھر اُبھرے گا۔ وہ کہتے ہیں اچھا انتظار کرو:

"لیکن وہ کب آئے گا؟" یہ نہ میں جانتا ہوں نہ وہ جانتے ہیں اور نہ کوئی اور جانتا ہے۔ نہ میرے دادا جانتے تھے جو عمر بھر انتظار کرتے رہے اور اسی عالمِ انتظار میں عالمِ آخرت کو سدھار گئے۔ میں نے اپنا شجرۂ نسب دیکھا ہے۔ پوری اٹھارہ پشتوں سے اُس کا انتظار ہو رہا ہے لیکن وہ ایک بار جو گیا تو اب تک لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ آئے گا ضرور لیکن کب آئے گا کون جانے!

میں اکیلا ہی اس کا منتظر نہیں ہوں پوری ایک ملت اس کی منتظر ہے۔ صدیوں سے انتظار ہو رہا ہے۔ اس کی مدح میں قصیدے موجود ہیں۔ اس کی شان میں مضامین لکھے گئے۔ اس کی تعریف میں کتب تالیف ہو گئیں۔ اس کی حقانیت میں زمین سے آسمان تک دلائل کے انبار لگے پڑے ہیں۔ لیکن اس کے انتظار میں روزانہ سینکڑوں اور ہزاروں افراد قبر میں جا لیٹتے ہیں۔

بڑے بڑے حاکم آتے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہ آتے ہیں۔ آ کر اپنے تختِ طاؤس بچھاتے ہیں۔ اس کی شان میں قصیدے پیش کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن

جو آتا ہے۔ اس کے راستے میں چند دیواریں اور کھڑی کر دیتا ہے۔ جو آتا ہے وہ اپنی کوس لمن الملک بجاتا ہے۔ عیش و عشرت کے سامان اپنے چاروں طرف سمیٹتا ہے۔ اور پھر چلا جاتا ہے۔ نہ اُسے لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ نہ اس کے لئے زخم خوردہ سینے تنتے اور قوی بازو راستہ کھولتے ہیں۔ زمانہ اپنی ڈگر پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تمنائیں ابھر ابھر کر ماند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور آنے والے کے انتظار میں کتنے ہی مظلوم اپنی گرم سرد آہوں کے ساتھ آسمان کی طرف منتظر نگاہوں سے تکتے ہوئے قبروں میں جا لیٹتے ہیں۔

میں جدھر جاتا ہوں۔ مجھ پر اس کے مخالفین طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا نام لیتے رہو گے۔ تو حوادث کی چکی کے دو پاٹوں میں تمہیں پیسا جاتا رہے گا۔ تم کو اس نے کہہ رکھا ہے کہ سود سے بچو۔ لیکن تم کو سود کی کوئی نہ کوئی رمق دینی یا لینی ہی پڑے گی۔ بچ کر کہاں جاؤ گے۔ جس قدر سکڑو گے اور سکیڑا جائے گا۔ جس قدر دائرۂ رزق تنگ کرو گے مزید تنگ کیا جائے گا۔ ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ میں نہ جانے پائے گی۔ جب تک سودی نظامِ معیشت کی مہر اس پر ثبت نہ ہو گی۔ اضطرار کا نام لے لے کر اپنے ضمیر کو کب تک زندہ رکھو گے جنہوں نے اضطرار کی بنیاد پر عیش و مسرت کے محلات تعمیر کر لئے ہیں۔ کیا ان کے ایمان سے انکار کر سکو گے۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی درجے میں تمہیں اس مالِ حرام سے دو چار ہونا ہی پڑے گا۔ ورنہ لاؤ اپنا نظامِ زندگی۔ اگر تم میں یا اس میں کوئی جان ہے تو اسے برپا کر دکھاؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ میں وہ تین ہزار نشان زدہ فرشتے کہاں سے لاؤں جو ان مخالفین کی گردنوں پر گرز مار مار کر ان کی گردنوں کے مہرے توڑ دیں اور انہیں بتا دیں کہ چھوٹے گروہ بھی اللہ کے اذن و مدد سے بعض اوقات بڑے گروہوں پر غالب

آجایا کرتے ہیں۔

منڈی میں جاتا ہوں تو بلیک اور چور بازاری کے بھوت ناچتے ہوئے نظر آتے ہیں ان سے بھاگتا ہوں تو زندگی کے ہر بازار میں کسی نہ کسی کی سفارش سے ہی کھڑا ہو سکتا ہوں یا کسی کو دے دلاکر ہی عزّت و آبرو بچا سکتا ہوں۔ ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے ہر طرف زندگی لٹ رہی ہے۔ آبرو لٹ رہی ہے۔ شرافت سر پیٹ رہی ہے۔ خدا ترسی لرزاں و ترساں ہے۔ نیکی ہراساں ہے اور ضمیروں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ تاریکی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ اور دُور دُور تک روشنی کی کوئی کرن اُفق سے جھانکتی نظر نہیں آتی

میرے ایک دوست نے جس کا کاروبار بہت پھیلتا جا رہا ہے۔ اگلے دن مجھ سے کہا: "تم کس خیال میں ہو۔ ابھی بیس سال تو صرف اس بات کا انتظار کرو کہ قلعے کا دروازہ کُھلے اور آسمان کے مشرقی کنارے پر صبحِ کاذب کی وہ مدّھم روشنی نمودار ہو، جو صرف یہ پیغام لے کر آئے کہ ابنِ مسلم ابھی آزاد ہے، اور اسے اپنا ما فی الضمیر بے ضرر انداز میں مرنجاں مرنج اصول کے مطابق بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ ابھی بیس سال اور انتظار کرو" مجھے اس کی بات نے مایوس نہیں کیا۔ میرے دل نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ روشنی کی پہلی کرن کے نمودار ہونے میں ابھی کتنا وقت باقی ہے۔ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سپیدۂ سحری اُفق کے کس کنارے پر نمودار ہوگا کدھر سے ہوگا لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ بخدا میں بہت پُرامید ہوں۔ میں نے آدھی رات کے دانشور فلسفی کی یہ بات کبھی تسلیم نہیں کی کہ صبح کبھی نمودار نہ ہوگی اور اس رات کا ایک سرا صبحِ قیامت کے دامن سے وابستہ ہے۔ آدھی رات کا دانشور فلسفی جرات چاہیے کیے اس لئے کہ ظلمت میں بیٹھ کر ظلمت کی تعریف و توصیف کر لینا بہت

آسان ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ایسے دانشور فلسفی صبح کی ہر کرن کے مقابلے میں خائب وخاسر ہو کر کسی تاریک گوشے میں چھپ جایا کرتے ہیں۔ اور بیٹھے ہوئے اندھیری رات کا انتظار کیا کرتے ہیں۔

میں جس ملت کا فرد ہوں وہ کوتاہی عمل کے باوجود تیرہ صدیوں سے مایوس نہیں ہوئی ہے اور افق پر نظریں گاڑے زمانے کی تیز رفتار گاڑی پر سوار کسی خوش رو شہسوار کی منتظر ہے۔ جو نمودار ہوگا۔ تو اپنے ساتھ سارے مسائل کے حل اور سارے خزانوں کی کنجیاں لائے گا وہ کنجیاں جنہیں صرف محتاجوں، غریبوں، مسکینوں اور ستم زدوں کے ہاتھ ہی گھما سکیں گے! اور جن کے ہاتھوں سے ہی زمین کے خزانے اپنا سونا اگلیں گے۔ اس لیے میں بھی مایوس نہیں ہوں۔ اور اگر وہ نہ آیا۔ جس کا مجھے انتظار ہے تو میں اپنی ساری دولت۔ سارے خزانے ساری جائداد اور سارے کاروبار جو مقصدِ زندگی کی شکل میں مجھے حاصل ہیں اور جن کے ہوتے سے میں دنیا کا امیر ترین انسان ہوں۔ اپنے بیٹے کے حوالے کر جاؤں گا اور جاتے ہوئے کہہ جاؤں گا۔

"بیٹا میں نے تمہیں اس لئے پرورش نہیں کیا تھا کہ تو دنیا کمائے اور عیش وعشرت کرنے میں نے ٹیوشنیں کر کر کے اور پسینہ بہا بہا کر حلال کے چند لقمے جو تیرے حلق میں ڈالے تھے تو اس لئے نہیں کہ تو کسی بھی نظامِ غالب کی سول سروس کا کارندہ بن کر اس کی جڑوں کو مضبوط کرے۔ میں نے تو تمہیں اس لئے پالا تھا کہ وہ کام کرو جو معاذ و معوذ نے کیا تھا جو میدانِ بدر میں سر ہتھیلیوں پر رکھ کر رسولِ اکرمؐ کے دشمن لشکر کے سردار پر پل پڑے تھے، اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔ تمہیں بھی زندگی کے میدانِ بدر میں جن سے کشمکش ہے۔ تمہیں اپنا سارا خون ان کی قوت کو حق کے سامنے جھکا دینے کے لئے بہانا ہے۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی

فرمائشوں کو میں اسی دن کے لئے پورا کرتا رہا ہوں کہ تم میری ایک بڑی فرمائش کو پورا کرو
میں قبر میں لیٹ کر بھی زمین پر تمہاری سرگرمیوں کی دھمک سنتا رہوں گا اور اس دن کا انتظار
کروں گا۔ جب تم سے پھر ملاقات ہو۔ اس دن میں تم سے اپنے بہائے ہوئے پسینہ
کے ایک ایک قطرے کی قیمت وصول کروں گا۔ اور جب تک تم یہ ثابت نہ کرو گے
کہ تم نے میرے مقصدِ زندگی کے دشمنوں کو عین میدانِ جنگ میں پچھاڑا۔ میں تمہارا
سلام قبول نہیں کروں گا۔

میں مرتے ہوئے اپنے ہونہار بیٹے سے کہہ جاؤں گا کہ باطل کے حامیوں سے
جنگ جاری رہے۔ ان سے کشمکش ختم نہ ہونے پائے۔ اور اگر یہ جنگ طول کھینچے
تو کھینچنے دو۔ جہاں باطل مقاصد کے لئے ابنِ آدم نے سو سالہ جنگیں لڑی ہیں وہاں حق کے
لئے یہ جنگ بھی چلے، نسل در نسل چلے، رُکنے نہ پائے۔ تا آنکہ باطل مٹے اور حق غالب
ہو اور سب سے بڑی سچی بات یہ ہے کہ حق کو یہی زیب دیتا ہے کہ وہ غالب ہی ہو اور
باطل کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ تباہ و برباد ہو۔ اور دھواں بن کر اڑ جائے۔

مجھے اس دن کا بھی انتظار ہے۔ جب اس ملّت سے حساب طلب کیا جائے جو
یزیدوں کو پالتی اور حسینوں کی شہادت پر چپ چاپ خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔
جو بادشاہوں کے خاندانوں کے خاندان پیدا کرتی، پالتی، ان کے سامنے کورنش بجا لاتی۔
اور ان کے لئے ہر دور میں عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتی ہے اور ایک حاکمِ مطلق کے
احکام کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی ہے جو ملوکیتوں کو صدیوں
تک اپنے خون سے سینچتی ہے۔ لیکن خلافتِ الٰہیہ کو تیس سال بھی اپنے اندر حفاظت
سے نہیں رکھ سکتی۔ جو ظالموں کے لشکروں کی رضا کار بنتی ہے لیکن مظلوموں کے خون کو

اپنی آنکھوں کے سامنے بہتے اور خشک ہوتے دیکھتی ہے لیکن دم نہیں مارتی۔ ان سب باتوں کا بھی حساب ہونا ہے۔ یہ ایک پوری اُمت کا بہت بڑا مقدمہ ہے۔ جو ایک روز ایک عدالت میں پیش ہونا ہے۔ مجھے اس دن سے خوف بھی آتا ہے۔ لرزتا بھی ہوں لیکن اس عظیم مقدمے کو دیکھنے کا بھی مجھے انتظار ہے۔

مجھے اس حاکم کا بڑا انتظار ہے جس سے میں سرِراہ مل سکوں اور پوچھ سکوں کہ اس نے اپنے لباس میں اسراف سے کام کیوں لیا ہے۔ جس سے میں مسجد میں مل سکوں۔ اور پوچھ سکوں کہ میرا ہمسایہ کس جُرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ جس سے ایک ضعیف بڑھیا بھی اپنا حق بلا روک طلب کر سکے اور جو لوگوں کی معاشی مرتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ ان کے علم و تقویٰ کے اعتبار سے قدر کرے۔

مجھے ان ججوں کا انتظار ہے جو سلطنت کے حاکمِ اعلیٰ کو بھی اپنی عدالت میں کھینچ بلائیں اور انصاف کے تقاضے بے لاگ پورے کریں۔ جن کے ہاں پولیس کا اعتبار کم ہو اور شریف شہریوں کا اعتبار زیادہ ہو جو بیٹھے پر کوڑے کھانا برداشت کر لیں لیکن حق کے خلاف فیصلہ کرنا قتل سے زیادہ بدتر جرم سمجھیں۔

مجھے اس پولیس کا بھی انتظار ہے جو قانون کو بے لاگ نافذ کرے۔ اور جو دولت و قوت کے سامنے موم اور بیچارگی اور غربت کے مقابلے میں فولاد بن جانے والی نہ ہو۔ جو شریفوں کو اس لیئے پریشان نہ کرے کہ غنڈے اس کے ذریعے شریفوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں جو بے لاگ بے غرض شرافت اور نیکی کی قدر کرنے والی ہو۔

میں سراپا انتظار ہوں اور یہ انتظار میں نے وراثت میں پایا ہے۔ میں نے تہیّہ کیا ہے کہ اس دن کا انتظار مسلسل کرتا رہوں گا۔ جو اپنے ساتھ ابنِ آدم کی پائیدار آزادیٔ ضمیر

کا پروانہ لائے گا اور اس دن کو قریب تر لانے کے لئے مسلسل کوشش کرتا رہوں گا چاہے شبِ تاریک کے دانشور فلسفی میرے خلاف عالی درباروں میں کتنی ہی چغلیاں کھائیں ۔ امید اور انتظار میری کشتی کے یہ دو پتوار ہیں جو طوفانی سمندروں میں سے گزار کر مجھے ایک روز ضرور ہی ساحلِ مراد تک لے جائیں گے ۔

(انتظار)

۱۹۶۱ء

تنہائی کا گھر

میں لذتوں کو فنا کر دینے والا مقام ہوں، میں عزیت کا گھر ہوں، میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں۔ میرے دن راتوں سے زیادہ وحشت ناک ہیں۔ میری وسعت قبر سے کچھ زیادہ، اور میری ویرانی اور تنہائی گورستان سے کسی صورت کم نہیں ہے۔

میرے ان تاریک دنوں..... اور تاریک تر راتوں کے رفیق انسانی معاشرے کے وہ راندے ہوئے افراد ہوتے ہیں جن کی موجودگی مجھے خود اپنے وجود سے شرم دلاتی ہے میں اندر ہی اندر گھٹن محسوس کیا کرتی ہوں، ان کی بے صبری کی وحشیانہ حرکات کا مجھے ہزاروں برس سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی کسی کا خون بہا کر خونیں ماضی لے کر اپنے تاریک حال کے ساتھ میری تنگی کو تنگ تر کرنے کے لئے آجاتا ہے، اور کوئی کسی ایسے گھناؤنے جرم کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کی رفاقت سے میرے در و دیوار کو بار ہا گھن محسوس

ہوئی ہے اور میرے فرش نے اپنی اس توہین پر بارہا خاموش فریاد کی ہے۔ دنیا بھر کے مجرم، ظالم اور حق فروش ہزاروں برس سے میرے سینے پر آ آ کر مونگ دلتے رہے ہیں اور میری راتوں کو تاریک تر اور میرے دنوں کو سوگوار بناتے رہے ہیں۔ میں نے بارہا اپنے رب سے اپنی تذلیلِ مسلسل کی فریاد کی۔ بارہا میرے سینے کی آہوں نے میرے قلب و روح کو جھلس دیا اور میں اندر ہی اندر گھٹتی رہی، میری یہ ازلی و ابدی تذلیل میرے روح کا ناسور بنی رہی اور میں ہزاروں برس سے، اپنی پیدائش کے پہلے ہی روز سے ان ناپاک روحوں کی رفاقت میں اپنا سہاگ لٹاتی رہی۔

یہی وجہ ہے کہ میں تنہائی کا گھر ہوں، میں عزیمت کا گھر ہوں، میرے دن میری راتوں سے زیادہ تاریک اور میری راتیں مجرم کے ضمیر سے زیادہ وحشت ناک ہوتی ہیں۔

میں جیل کی ایک کال کوٹھڑی ہوں۔

لیکن میرے ان تا . اور سوگوار، مکروہ اور گھناؤنے، وحشت ناک اور اذیت کوش شب و روز میں کچھ دن ایسے بھی ہیں جو میری تاریک زندگی میں ہیرے کی کنی کی طرح چمکتے ہیں، کچھ ایسی راتیں بھی ہیں جن کی ضیا باری پر سورج نے اکثر حجاب سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا ہے، کچھ ایسے دن بھی ہیں جن پر مجھے اکثر مطلعِ صبحِ نشور کا دھوکا ہوا ہے، وہ شب و روز میری زندگی کا حاصل، میری روح کا سرمایہ اور میرے ہزاروں برس کے گھناؤنے ماحول کا بدل ہیں۔ ان دنوں کے بدلے اگر مجھے کوئی سورج کی تمام شعاعیں بھی دے تو نہ لوں، اور ان راتوں کے عوض میں مجھے چودھویں کے چاند کی ضیاباری بھی مطلوب نہیں ہے۔

میری سیاہ زندگی کا یہی ایک اثاثہ ہے۔ اور یہ میں نے اپنی روح کی گہرائیوں میں محفوظ کر رکھا ہے جو میں اپنے رب کے حضور میں بخشش کے لئے پیش کروں گی۔ اور مجھے اپنے پیدا کرنے والے اس کائنات کے مالک کی قسم ہے کہ میرا قلب مطمئن ہے کہ وہ ان شب و روز کے بارے میرے ہزاروں برس کے تاریک نامۂ اعمال پر اپنی رحمت کا سایہ ڈالے گا۔ اور میرے شب و روز کو قہقہوں سے معمور اور جنت کی شادابی سے نوازے گا۔

ان دنوں میں مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب اکیس بائیس برس کا ایک نوجوان کئی برس کے لئے میرے در و دیوار میں اس لئے محبوس کیا گیا تھا کہ باہر کا ماحول اس کی فطرت کی پاکیزگی، اس کی عصمتِ نگاہ اور اس کی عفتِ کردار کا متحمل نہ ہوسکا تھا۔ اس وقت میرا سینہ ہی اس کا امانت دار تھا۔ مصر کے رؤساء کی بیگمات نے اپنے اخلاق و کردار کا سارا سرمایہ اس نوجوان کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔ اور وہ اُسے ٹھکرا کر طہارتِ فکر اور ضبطِ نفس کے جرم کی سزا بھگتنے کے لئے میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں نے اس کے شب و روز کو برسوں تک دیکھا۔ میری زمین ان دنوں آسمان کا ہم پلّہ تھی۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ میری راتیں روشن اور دن روشن تر تھے اور میں نے خدائے واحد کا نام سُنا، جب اس نے اپنے دو قیدی ساتھیوں سے کہا:۔

"اے زندان کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں، یا ایک وہ اللہ جو سب پر غالب ہے؟"

ان دنوں میں نے اللہ رب العالمین کی خاص رحمتوں کو اپنے در و دیوار پر پرتوفگن دیکھا۔ ـــــــــ اور میں نے محسوس کیا کہ اللہ کی اس سرزمین پر انسان کے نام سے جو ایک مخلوق ہے اس میں فرشتوں سے بھی اونچی پرواز رکھنے والے افراد موجود ہیں۔

وہ دن بھی میں کبھی نہ بھولوں گی جب قافلۂ انسانیت کے امام نبی عربیؐ کا ایک رفیق، چند دن کا بھوکا پیاسا میری گود میں ڈالا گیا تھا۔ وہ نبیٔ عربیؐ جو اُن دنوں انسانی قافلے کو جاہلیت سے اسلام کی طرف سے اور وحشت سے تہذیب و تمدن کی طرف اور شرک و بت پرستی سے خدا پرستی کی طرف لانے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے اس رفیق کو تبلیغ دین کے لئے روانہ کیا تھا، اور کفار نے دغا بازی سے گرفتار کر کے قید کر دیا تھا، اس کے شب و روز کو بھی میں نے غور سے دیکھا، کفر کے اس ماحول میں اس کی زبان اللہ کی حمد سے تر تھی، اس کا دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور تھا، اس کی ہمت کو میں نے ہمالہ سے بلند پایا۔ جب اُس سے کہا گیا۔

"اگر تم اسلام کو چھوڑ دو تو تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے۔"

تو اس نے پھانسی کے کھمبے کے عین نیچے کھڑے ہو کر کہا۔

"جب اسلام نہ رہا تو میں جان کو رکھ کر کیا کروں گا؟"

اور وہ دو رکعت نماز پڑھ کر مرضئ مولا کے مطابق نیزوں سے چھدا ہوا سولی پر لٹک گیا۔ اس کی غیرت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ نماز کو طول دے، مبادا اسے موت کا ڈر سمجھا جائے۔ آہ ان مقدس قدموں میں زنجیروں کی جھنکار اب تک میرے در و دیوار میں گونجتی ہے اور وہ دن بجلی کا کوندا بن کر میرے سیاہ خانے پر چمک جاتے ہیں۔

ان زنجیروں کا نغمہ بھی میرے لئے رُوح افزا ہے، اور میرا سرمایۂ افتخار جب ایک مردِ حق پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں پہنے، مجھے داغ مفارقت دے کر مکہ سے مدینہ روانہ ہوا تھا۔ گویا ایک بچھڑا ہوا پنچھی اپنے جھنڈ سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ زنجیریں جھنجھناتا اور بیڑیاں گھسیٹتا عین اس وقت اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تھا جب صلح حدیبیہ کا معاہدہ تکمیل پا رہا تھا۔ کفر کے سفیر نے بگڑ کر کہا:۔

"معاہدے کی رُو سے اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

معاہدہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ لیکن خُلقِ عظیمؐ نے حکم دیا، کہ اسے قریش کے حوالے کر دیا جائے:

یوں ایک مظلوم اپنے ساتھیوں کے سامنے تکریمِ عہد کے عوض مشکیں باندھے، زنجیریں پہنے کشاں کشاں میری طرف لوٹایا گیا۔

وہ دن میری زندگی کا سرمایہ ہیں، جب وہ کُفر کے گڑھ میں قید و بند کے دن گزارتے ہوئے اللہ کی عظمت و جلال بیان کیا کرتا تھا، اور میرے در و دیوار کا ذرہ ذرہ ہمہ تن گوش ہو کر سُنا کرتا تھا۔ اس طرح ایک سال کے اندر اس نے قریش میں سے تین سو سعید رُوحوں کو نبیٔ عربیؐ کے پیغام کا ہمنوا بنا لیا تھا۔

میری زندگی کے وہ دن بھی میری تاریک قسمت کے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مانند ہیں۔ جب ایک مردِ حق ابنِ ہبیرہ اور ابو جعفر کے ظلم کا مقابلہ کرتا ہوا میری سونی زندگی کو تقدس سے معمور کرنے کے لئے ایک مہمانِ عزیز بن کر آیا تھا، اور اس طرح آیا کہ پھر زندگی کی آخری سانس تک مجھ سے کبھی جدا نہ ہوا۔ وہ سیدھا میرے ہاں سے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچ گیا۔ اس نے ابنِ ہبیرہ اور ابو جعفر کا آلۂ کار بننے

سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے حق پوشی کا مسلک اختیار کرنے والے علماء کے عظیم ہجوم میں سے نکل کر اپنے آپ کو حق پناہی کے منصب جلیل پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے مصلحت کوشی اور مداہنت کو دھتکار کر اپنے ہاں سے نکال دیا تھا، اس کا جرم یہ تھا، کہ اس نے حق فروشی سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات کا کاروبار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے خدا سے ڈر کر انسانوں کے ڈر سے اپنے دل کو خالی کر لیا تھا، اور میری آنکھوں دیکھا ظلم مجھے یاد ہے جب میں اللہ کے ہاں ابن ہبیرہ اور ابن جعفر کے خلاف گواہی دینے کے لئے حضور حق میں کھڑی ہوں گی تو میں صاف صاف شہادت دوں گی کہ۔

اسے کوڑوں سے پیٹا گیا۔ اس کا جسم ننگا کر کے تازیانوں کی مسلسل مار ماری گئی، اس کی پیٹھ زخموں سے خونچکاں تھی، اور خون بہ کر ایڑیوں تک پہنچ گیا تھا، اسے اذیتیں دی گئیں، اور ظالموں نے اس پر زندگی تنگ کر دی لیکن وہ مرد حق جانتا تھا کہ زندگی کی اصل کشادگی رب العالمین کی مرضی میں ہے اس لئے اس نے تمام جباروں کی مرضی کو ٹھکرا کر اپنے رب کی مرضی اختیار کر لی۔ وہ میری بد نصیب آنکھوں کے سامنے جبراً فرش پر پٹخا گیا اور اس کے منہ میں زہر کا پیالہ انڈیل دیا گیا۔ آج تک میرے در و دیوار اس نظارہ کو اپنی چشم عبرت میں چھپائے ہوئے ہیں، اور میرا فرش اس کے خون کے قطروں کو آبدار موتیوں کی طرح محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ بارہا فرشتوں کے ایک ہجوم نے حضور حق میں پیش کرنے کے لئے مجھ سے ان خون کے قطروں کو طلب کیا ہے لیکن میں نے اس متاع بے بہا کو اپنی آخرت کا سرمایہ بنا کر محفوظ کر رکھا ہے۔

میرے پاس وہ شخص بھی لایا گیا جو امام دار الہجرت کہلاتا تھا۔ جس کے علم و عظمت کا سکہ پورے عالم اسلام میں رواں تھا، میں نے اسے اپنے پاس اس حال میں دیکھا کہ

اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ وہ بھی جرم حق گوئی کی پاداش بھگتنے کے لئے محبوس کیا گیا تھا۔ اس کی مشکیں اس زور سے کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے تھے اور ستر کوڑوں کی ضربیں اس کے جسم پر میرے سامنے ایک ایک کرکے پڑیں، اسی حال میں وہ فریضۂ شہادتِ حق ادا کرنے کے لئے اسی اونٹ پر کھڑا ہوگیا جس پر تذلیل وتشہیر کے لئے اُسے سوار کرایا گیا تھا۔ اس نے پکار پکار کر کہا۔

"جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو وہ جان سلے کہ میں مالکِ انس کا بیٹا ہوں، اور اس مسئلے کا اعلان کرتا ہوں، جس کے اعلان سے مجھے جبراً روکا جارہا ہے کہ جبری طلاق کوئی چیز نہیں۔"

میں نے دیکھا کہ اس عزیمت کے آگے شاہوں کی کلغیاں جھک گئی تھیں۔ اس کی رفاقت میں گزرے ہوئے وہ دن میری گنہگار زندگی کا حاصل ہیں انہیں دنوں کی یاد میرے مستقبل کے لئے روشنی کا مینار ہے۔

وہ صبر واستقلال کا شہنشاہ، وہ تحمل وبردباری کا ہمالہ وہ غیرت وحق گوئی کا مجسم ظہور، وہ جس کی حق گوئی کے سامنے مامون، معتصم اور واثق جیسے جابروں کے ظلم وتشدد کا زہرہ آب آب ہوتا تھا۔ وہ بیس سال تک میرا شریکِ شب وروز رہا۔ وہ دن میری زندگی کا سہاگ تھے، اور میری ویران آبادی کی رونق پُر بہار تھے۔ میں نے اس مومن کی عزیمت کو ایک زمانے تک اپنے سینے میں امانت کا آبدار موتی بنا کر رکھا ہے۔

میں نے اس معتصم کی بے چارگی اور درماندگی کو اس کے سامنے دست بستہ دیکھا ہے۔ جس کی ہیبت ورعب سے قیصر روم لرزاں وترساں رہا کرتا تھا کہ وہ بڑی منت اور خوشامد سے اس شخص سے مخاطب تھا جسے جلادوں کا ایک تازہ دم دستہ گھیرے ہوئے تھا۔

" واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لئے شفیق ہوں۔ اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کر لو تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں"

لیکن یہ شفقت حق پر بے اثر تھی۔ وہاں صرف ایک جواب تھا:
"اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو، یا اس کے رسولؐ کا کوئی قول پیش کر دو تو میں اقرار کر لوں، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا"

اور پھر میں نے دیکھا کہ چار چار بوجھل بیڑیاں اس کے پاؤں میں ڈالی گئیں۔ اس بوجھ سے وہ ہل نہ سکتا تھا، اٹھتا تھا اور گر پڑتا تھا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں جب کہ دھوپ کھال کو جھلستی تھی اسے میرے صحن میں جلتی دھوپ میں بٹھایا گیا، اور صرف بٹھایا ہی نہیں گیا بلکہ لگاتار کوڑے مارے گئے۔ ہر جلاد دو ضربیں لگا کر ہٹ جاتا تھا اور اس کی جگہ تازہ دم جلاد آتا تھا اور وہ جواں مردِ حق کی پشت پناہی کے لئے پہاڑ کی طرح قائم تھا۔ وہ روزہ رکھے ہوئے تھا اور پیٹھ کوڑوں کے زخموں سے خونچکاں تھی۔

"مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہی جھکا سکتا ہے"

اور واقعہ یہ ہے کہ اسے کوئی نہ جھکا سکا۔ جو صرف خدا کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی ہر جبّار کے جبر سے بلند و بالا تھی۔

میں اگرچہ تنہائی کا گھر ہوں اور عزت کا گھر ہوں۔ لیکن میں نے ایسے ایسے شاہنشاہوں کو بھی اپنی آغوش میں جگہ دی ہے اور انسانیت کی ایسی ایسی عظیم امانتوں کو بھی اپنے دامن میں رکھا ہے۔ میں انہیں دنوں کی یاد سے اپنے سیاہ خانے کو روشن رکھتی ہوں۔

پھر وہ حسین و جمیل صورت میری آنکھوں سے محو نہیں ہوئی جس نے ساری عمر میری آغوش میں گزار دی، جو چہار دیواری میں محبوس رہ کر بھی بدعت و شرک کا دشمن رہا اور اس کا قلع قمع کرتا رہا جس کی ہیبت سے اس کے دشمن اس وقت بھی کانپتے تھے جب کہ وہ قید و بند کی سختیاں سہہ رہا تھا۔ میں گواہ ہوں کہ اس نے میری موجودگی میں میری ہی چھت کے نیچے بیٹھ کر وہ کتابیں ترتیب دیں جنہوں نے اسلام کا چہرہ ہر گرد و غبار سے نکھار کر پیش کر دیا۔ اس کی عزیمت کو نہ مخالفوں کی یلغار روک سکی، اور نہ جابروں کی قید و بند۔ جب ظالموں نے قید میں اس سے قلم دوات بھی چھین لی تو اس نے کتاب سازی چھوڑ کر، کردار سازی شروع کر دی اور وہ لوگ جو قاتل، رہزن اور ڈاکو تھے، وہ لوگ جو رذائل اخلاق سے چور چور تھے ان کو چند ہی دنوں میں فرشتہ خصلت بنا دیا۔ میں نے یہ انقلاب بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جن لوگوں کو حکومت کی تعزیریں سدھار نہ سکیں ان کی زندگیوں میں اس مرد حق کی ایک نظر نے انقلاب برپا کر دیا، اور آخر کار اس نے میری ہی گود میں جان دی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اس کی آخری رفاقت کا بھی حق ادا کیا۔ جس نے اس قدسی نفس کو دیکھا کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور جانے کے لئے کتنا صاف اور پاکیزہ ضمیر رکھتا تھا۔ اس کی یاد بھی میرے سینے کا بیش بہا خزانہ ہے اور اس کی معیت میں گزرے ہوئے شب و روز بھی میرے لئے بخشش کا سرمایہ ہیں جسے میں نے زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر رکھا ہے۔

یہ نہ سمجھو کہ غربت اور تنہائی کا یہ گھر سرمایۂ حیات سے بالکل تہی دامن ہے۔ میرے پاس اس مرد حق کی یاد کا خزانہ بھی ہے جس نے جہانگیر کے جبروت اور بدعت نوازی

کو چیلنج کیا تھا جس کے بارے میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے کہا۔
"میں چراغ نہیں ہوں، چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا، چراغ تو شیخ احمدؒ سرہندی ہے" جس نے دینِ الٰہی کے فسق و فجور اور الحاد و زندقہ کے خلاف عَلم اٹھایا تھا۔
جب بڑے بڑے تاج العارفین اکبر کو خلیفتہ اللہ اور انسانِ کامل قرار دے رہے تھے۔ وہ شہادتِ حق کے جُرم کا کُھلم کُھلا مرتکب ہوا، اس جُرم کی پاداش میں اُسے میرے حوالے کر دیا گیا، جہاں وہ چند برس رہا لیکن مجبور و محبوس شب و روز میں بھی وہ اپنے مورچے کا بہترین سالار تھا۔ اس نے بالآخر جہانگیر کو جھکا دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ حق جہاں کشائی کی سب سے بڑی قوّت ہے۔ اس کا مقابلہ جبر و تشدد سے کرنا مغلِ اعظم کے بس میں بھی نہیں ہے۔
میں اُن ایّام کو یاد کرتی ہوں جب وہ میری چھت کے نیچے بیٹھ کر دعوت و تبلیغ کے لیے مکاتیب لکھا کرتا تھا، جن کے ذریعے اس نے بے شمار کفر زدہ اور جاہلیت گزیدہ دلوں کو حق کے لیے مسخّر کر دیا تھا۔ وہ میری زندگی کے بڑے روشن اور پُر نور دن تھے وہ عاشقانِ حق جن کی سیّد اسمٰعیل شہیدؒ اور سیّد احمد شہیدؒ نے جمعیت بندی کی تھی، ان میں سے بہت سے صالحین کو مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا وہ انہیں میں سے ایک تھا جو تھانیسر سے گرفتار ہو کر آیا تھا اور جسے زیورِ حق بیڑی، ہتھکڑی، طوق اور زنجیر سے پوری طرح آراستہ کیا گیا تھا، اس کی شبیں زندہ دار تھیں اور اس کے دن تسبیح و تہلیل کے دن تھے۔ وہ اپنے مقصدِ حق کا اتنا سچا عشق رکھتا تھا کہ راہِ حق میں موت عین اس کے لیے حیات تھی، اور وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح موت کا استقبال ایک دل نواز دلہن سے زیادہ ذوق و شوق سے کرتا تھا جب اُسے ناکردہ

گناہوں کا اقبال کرنے کے لئے مجبور کیا گیا، تو شدّتِ ظلم و تشدد سے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ظالم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے، چنانچہ اس کے چند روزے جو باقی تھے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔ وہ دن بڑا ہی رنج و الم کا دن تھا جب وہ روزے سے تھا اور اسے صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک مسلسل پیٹا گیا لیکن اس کے لبوں سے یہی دعا جاری تھی۔

"اے رب یہی وقت امتحان کا ہے، تو مجھے ثابت قدم رکھیو!"

اور رات کو بارہ گھنٹے کی مسلسل زدوکوب کے بعد جب اسے چھوڑا گیا تو اس نے درخت کے پتوں سے روزہ افطار کیا، اور چشم فلک نے دیکھا کہ جس زمین پر جانوروں کے لئے بھی بھوک رفع کرنے کے ذرائع کھلے ہیں وہاں ایک مردِ حق کو افطار تک کے لئے ایک درخت اپنے برگِ سبز سے زیادہ کوئی تحفہ پیش نہ کر سکا، تب مجھے پتہ چلا کہ وہ جو میں نے بارہا ایسے ہی مردانِ حق کی زبانی سنا تھا کہ جنت کانٹوں سے گھری ہوئی ہے، تو اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کے ساتھیوں میں سے ایک کی ڈاڑھی جب ظلم و تشدد سے کاٹی گئی تو وہ اپنی ڈاڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتا تھا۔

"افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کاٹی گئی"

ڈاڑھی کے وہ بال بھی میرے نامعلوم گوشوں میں محفوظ ہیں اور میں نے ان کو سفرِ آخرت کا توشہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔

اس پُر آشوب دَور میں بھی ایک بیش بہا دولت میرے حوالے کی گئی جس کے سبب فخر سے میں اپنی گردن بلند کر سکتی ہوں۔ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ بڑے سے بڑے رئیسِ مملکت کے قصرِ بلند سے میرا تاریک سینہ زیادہ روشن، بلند بخت اور زیادہ خوش نصیب ہے

مجھے اس مردِ حق آگاہ کی آمد اچھی طرح یاد ہے، جب وہ آیا تو میرے در و دیوار ایک نامعلوم ضیاء سے چمک اٹھے تھے، اس کی آمد نے میری برس ہا برس کی تہی دامنی کو حق پناہی کی دولت سے معمور کر دیا۔ وہ یہ کہتا ہوا میری چہار دیواری میں داخل ہوا کہ "خدا کی زمین پر خدا کی حکومت کے سوا اور کسی کی حکومت مجھے گوارا نہیں ہے، اور میں ہر اس شخص کا باغی ہوں جو خدا کا باغی ہے"

اس ایک کلمۂ حق نے اس کے ملک کی آزاد سرزمین اس پر تنگ کر دی، اور وقت کی جابر قوتوں نے محسوس کر لیا کہ اصل خطرہ کہاں تھا۔ چنانچہ جب وہ میری آغوش میں اپنے جرم بے گناہی کی سزا بھگتنے کے لئے آیا تو میرے در و دیوار کے بیرونی اطراف نے سنا کہ اس کے خلاف وہ وہ الزامات ہوائیں پھیلائے جا رہے تھے جن سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا، وہ صبر و سکون کے ساتھ آیا اور میرے شب و روز زیادہ سے زیادہ پُر رونق بناتا رہا۔ اس نے ملک کے بناوٹی خداوندوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا جرم اس کے سوا کوئی نہیں کہ میں اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام چاہتا ہوں، اور اس کا مطالبہ کرنے میں کوئی لالچ، خوف اور جبر و زیادتی مجھے باز نہیں رکھ سکتی، اس لئے کہ میرے نزدیک تشدد دھاندلی اور قید و بند کی دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی۔

پھر اسے سزائے موت سنا دی گئی اور اسے پھانسی کے مجرموں میں محبوس کر دیا گیا میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک لازوال نور کھیل رہا تھا وہ گویا اس زمین کے ان جباروں کی کم عقلی اور چھچھورے پن پر مسکرا رہا تھا۔

جسے یہ لوگ ایک بھرپور وار سمجھ رہے تھے۔ وہ اسے اپنی منزل کی راہ میں ایک قدم سمجھ رہا تھا۔ مطمئن، مسرور، بے نیاز، متوکل، صابر، اور سر بلند، وہ میری آغوش میں

بیٹھا ہوا دُنیا والوں کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا اور جب اسے موت کی خبر سنائی گئی تو اس نے کہا:۔

" اگر میرے رب کی مرضی یہی ہے تو بندہ بھی بہت خوش ہے کہ اپنے رب سے جاملے۔ اور اگر اس کی مشیئت یہ نہیں ہے تو پھر کسی کے بس میں نہیں ہے کہ مجھے پھانسی پر لٹکا سکے"

میں اگرچہ غربت کا گھر ہوں۔ تنہائی کا گھر ہوں لیکن میرا سینہ عرفانِ الٰہی کے انوار سے معمور ہے، میری زمین چاند تاروں والے آسمان کے ہم پلّہ ہے، اور میری چھت عرشِ الٰہی کی قدم بوسی کے لئے کوشاں ہے۔ میرے شب و روز کی روائتی تاریکی نے میرے گرد و پیش کو روشن کر رکھا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ جنّتِ عدن جسے کہا جاتا ہے وہ شائد اسی خطۂ زمین کا نام ہے۔ جہاں ایک بندۂ حق اپنے مولا کی مرضی پوری کرتے ہوئے آباد ہو اسی صورت میں میری تنہائی غربت اور گورستان کی سی سنسانی اور ویرانی رشکِ ہزار رونق آبادی ہوتی ہے۔

اگرچہ حقیقتاً میں تنہائی کا گھر ہوں، کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں، اور لذّتوں کو فنا کر دینے والا مقام ہوں لیکن مجھے اکثر ان مردانِ حق پرست کی رفاقت میسّر رہی ہے جن کی سعی و عمل اور جدّ و جہد کے ساتھ فرشتے بھی ان کے ہم عناں ہوتے ہیں۔

(تصویریں)

۱۹۵۴ء

فریاد

"اے اللہ میں برباد ہوگیا ہوں۔ تو دیکھ رہا ہے۔"

زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا وہ ضعیف میکلوڈ روڈ کی سنگین فٹ پاتھ پر چلا جارہا تھا۔ تنہا چلتے چلتے اپنے مالک سے وہ اس طرح باتیں کررہا تھا جس طرح اس کا ننھا پوتا اس سے لڑکھڑا لڑکھڑا کر انتہائی انس و محبت اور اعتماد سے باتیں کیا کرتا تھا۔ ان الفاظ میں کوئی ایسی شوکت نہ تھی لیکن قریب سے گذرتے ہوئے جب میں نے وہ الفاظ سنے تو ہیبت کے مارے کانپ گیا۔ خوف سے میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین کی طرف جھک کر دیکھا اور گرد و پیش میں ایک عجیب اضطراب سے دیکھا۔ گویا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوجانے والا تھا۔ کہنے والا بالکل بے خبری اور محویت میں بڑبڑاتا ہوا گزرا چلا جارہا تھا۔

ایک کمزور ڈھانچہ گاڑھے کی قمیص جو دونوں شانوں سے پھٹی ہوئی تھی۔ ایک ملگجا

پاجامہ۔ پاؤں میں پھٹا ہوا جوتا۔ جس میں سے اس کے پاؤں کے پنجے نمایاں تھے۔ گھسٹتی ہوئی ایڑی۔ سر پر ایک بوسیدہ تولیہ۔ ڈاڑھی سفید اور پریشان۔

اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے قریب سے گزرنے والا شخص اس کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا اسے اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنے اللہ سے اتنی حضوری حاصل تھی جتنی کسی زاہد شب زندہ دار کو شب بھر تنہائی اور سکون میں جاگنے کے باوجود بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے الفاظ سے نمایاں تھا کہ وہ کسی بالاتر ہستی کو دیکھ رہا تھا اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا تھا تو اس بات کا اپنے وجود کی موجودگی سے بھی بڑھ کر یقین رکھتا تھا کہ کوئی اس کی بات کو بہت قریب سے سن رہا تھا۔ اتنا قریب سے جس قدر اس کا اپنا تنفس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ گزر رہا تھا اور زیر لب بڑبڑا رہا تھا تو اس کی آواز یوں تھی جیسے سرگوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے الفاظ خزاں کے جھونکے کی طرح تھے۔ ــــــــــ

ــــــــــ اس کے الفاظ میں وہ گہرا جذبہ تھا جو کسی قریب ترین جانی بوجھی ہستی کے لئے پیدا ہو سکتا ہے۔ کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کوئی تکلف نہ تھا۔ کسی دور کی ہستی سے وہ مخاطب نہ تھا۔ کسی بے جانی بوجھی ہستی کا غائبانہ ذکر نہ تھا۔

اتنا قرب۔ اتنی حضوری۔ اتنی بے تکلفی۔ اتنا خلوص۔ اتنا اعتماد۔ اور اتنا یقین کہنے والے کو سننے والے سے کبھی ایک دوست کو دوسرے دوست سے نہ ہوا تھا۔ جتنا فٹ پاتھ پر چلنے والے اس ضعیف آدمی کو اپنے اللہ سے حاصل تھا۔

" اسے اللہ میں برباد ہو گیا ہوں اور تو دیکھ رہا ہے۔"

اور ان الفاظ میں کہنے والے کی ساری داستان پوشیدہ تھی۔ اسے داستان سنانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ وہ داستان کی تفصیلات سے

بے نیاز تھا۔ وہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی اتنی ہی قربت سے جانتا تھا۔ جس قدر کوہِ ندا پر کہی ہوئی بات کو۔ وہ ان خیالات سے بھی آگاہ تھا جو ایک تھتلاتے ہوئے معصوم بچے کے ذہن میں پرورش پاتے اور ان سے بھی آگاہ تھا جو مرنے والے کی گنگ زبان سے ادا نہ ہو سکتے تھے وہ اس قادرِ مطلق سے اپنی دوحرفی داستان کہہ رہا تھا۔

"اے اللہ میں برباد ہو گیا ہوں اور تو دیکھ رہا ہے۔"

مجھے ڈر معلوم ہو رہا تھا کہ جس سے وہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں تو یہ ساری کائنات تھی۔ اس کی مٹھی میں تو ان برباد کرنے والوں کی پیشانی کے بال تھے جنہوں نے اسے دردمند کیا تھا۔ اس فریاد کرنے والے کی آواز میں میں نے انتقام کو بھڑکا دینے والا وہ عجز محسوس کیا جو "اللہ کی مدد کب آئے گی" کے جملے پر اعدا کے حصے میں آیا کرتا ہے اس کے اس قوی ترین عجز نے، اس کی اس انتقام انگیز فریاد نے اس کی اس بے لفظ داستانِ درد نے میرے اندر ایک گہرا گھاؤ لگا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلب پر ایک برف کی سِل تھی جو اس کی گرمیٔ فریاد سے پانی پانی ہو کر بہہ گئی تھی۔ پاش پاش ہو گئی تھی، بے حِسی کی ایک چٹان تھی جو ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور اس چٹان کے نیچے میں نے اپنے عجز۔ اور بندگی کو تازہ دم پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو بندگی میری قوت تھی اسے میں نے ایک عرصہ سے جمود۔ بے حسی بلکہ سنگدلی کے نیچے دفن کر رکھا تھا اور اس کی قوت سے بے خبر تھا۔

اس کا اپنے اللہ سے اتنا قرب اور اعتماد انگیز طرزِ عمل دیکھ کر میرے اندر بھی ایک خروش بیدار ہو گیا۔ وہ شخص کتنی بڑی طاقت کو متحرک کر رہا تھا۔ کتنی بڑی پناہ کو آواز دے رہا تھا۔ کتنے بڑے ذریعے کو بلا رہا تھا۔ کتنے بڑے وسیلے کو پکار رہا تھا۔

وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اسے لا رہا تھا جس کے مقابلے میں پہاڑوں کے سلسلے اور جس کے اشارے پر اجرامِ فلکی کے گولے حرکت کرتے تھے۔ اس کے لئے قلب میں اس گداز کی، فریاد میں اس توکل کی اور سعی میں اس بھروسے کی ضرورت تھی جو فریاد رس کو اگر دیکھ نہ سکے تو کم از کم اس کے وجود کو اپنے قلب سے بھی زیادہ قریب محسوس کر سکے۔

ایک خروش میرے سینے میں اُبلنے لگا۔ ایک فریاد جو بے لفظ تھی لیکن داستان در داستان تھی جو کربلا سے شروع ہوتی تھی اور بالاکوٹ تک پھیلتی چلی جاتی تھی جس میں امام حسینؓ سے لے کر حسن البناء شہیدؒ تک ابھرتے نظر آتے تھے۔ وہ فریاد بے لفظ اور بے آواز میرے سینے میں ابلنے لگی، مجھے بھی اپنے رب سے فریاد کرنی تھی۔ مجھے بھی اپنے رب سے کچھ کہنا تھا۔ بہت کچھ کہنا تھا۔ اتنا کچھ جس کے لئے الفاظ کے انبار بھی ناکافی تھے۔ اتنا کہنا تھا جتنے میرے جسم پر بال تھے جتنے آسمان پر تارے تھے۔ جتنے سمندر میں قطرے تھے۔ جتنے صحرا میں ذرے تھے لیکن میرے پاس الفاظ نہ تھے صرف ایک غبار تھا۔ جو قلب سے آسمان تک پھیل گیا تھا اور میں اس غبار میں خزاں دیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

میرے اللہ تیرا دین مغلوب ہے اور تو دیکھ رہا ہے۔

یہ الفاظ میرے ہونٹوں سے پھسل کر نکل گئے تھے۔ جیسے چڑھتی ہوئی کمان سے تیر نکل جائے۔ ایک غبار تھا جو قلب تک چھایا ہوا تھا۔ اس جملے سے اس میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ آندھی چڑھتی رہی۔ بے لفظ داستان سینے میں اُبلتی رہی۔ بے آواز فریاد سینے میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرا قلب

قبلہ رُخ ہو کر میرے سینے میں سجدہ ریز تھا اور میرے عجز اور بندگی کو دعوت دے رہا تھا کہ وہ آئے اور اس فریاد کو مالکِ حقیقی کے سامنے پوری عاجزی سے پیش کرے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ غبار عاجزی میں ڈھل رہا تھا۔

"کیا یہ وہی وقت ہے جب تیرا نام لینا مٹھی میں انگارہ پکڑنے کے مانند ہو جانے والا تھا۔ اگر یہ وہی وقت ہے تو مجھے ان انگاروں میں دفن کر دے۔ اس لئے کہ یہ وہی آگ ہے جو ابراہیمؑ کے لئے بھڑکائی گئی تھی۔"

"میرے اللہ تاریخ پھر ایک زمانے کے بعد معرکۂ بدر کو دہرانے کے لئے آئی ہے۔ ایک مٹھی بھر جاں نثار جو صرف تیرے لئے جینا اور مرنا جانتے ہیں اور جن کو اس بانجھ معاشرۂ انسانی نے مدت بعد جنا ہے جن کے لئے صدیوں بعد تاریخ اپنا سینہ کھول کر آئی ہے کہ اس پر بڑھ کر تیرا نام لکھ دیا جائے۔ اس وقت جب کہ برسوں خون کو پسینہ بنا کر بہانے کے بعد تیرے بلند نام کو چار دانگ عالم میں پکارنے کے لئے ایک مینار کی ابتدائے تعمیر ہوئی ہے۔ اور طاغوت کے ساتھی بڑھ چڑھ کر اس تعمیر کو گرا دینے کے لئے حملے اور سازشیں کر رہے ہیں۔ تو دیکھ رہا ہے کہ ایک طرف ساز و سامان ہے اور دوسری طرف تیرے نام کی قوت اور تیرے رسول کی غیرت کا سہارا ہے اور تو دیکھ رہا ہے کہ تاریخ کے اس دور نے سینکڑوں ابوجہل اور ابولہب جنم دیئے ہیں۔ ابلیسوں کے سر پر منافقت کا تاج رکھ دیا ہے اور ایک بڑے زور کی کشمکش سر پر کھڑی ہے۔ ماموں اور بھانجا۔ بھائی اور بھائی۔ چچا اور بھتیجا۔ باپ اور بیٹا یوں آمنے سامنے آئے ہیں جیسے تب آئے تھے جب تیرا نام پکارنے کے لئے صدیوں پہلے ایسا ہی ایک معرکہ بپا ہوا تھا۔ اگر اس دور میں تیری مشیت کی سنت یہ ہے کہ آرے جسموں کو چیریں تو یہ جسم تیری راہ میں بکے ہوئے ہیں۔ اگر اشارہ

ہے کہ لوہے کی کنگھیاں اپنا فرض ادا کریں تو یہ تیرا ہی مال ہے۔ تو اسے جس قصاب کے حوالے کرنا چاہے کردے لیکن تو بہتر جانتا ہے اور تجھ سے بڑھ کر کس میں جاننے کی ہمت ہے کہ یہ مٹھی بھر انسان صرف تیرے ہی نام کا مینار تعمیر کر رہے ہیں اور تیری ہی اذانِ حق بلند کرنا چاہتے ہیں اور تجھے ہی منانے کے لئے سارے جہاں سے روٹھے ہوئے ہیں۔ اور تیری ہی چشمِ التفات کا ایک گوشہ ان کے لئے بہارِ زندگی ہے۔ تو انہیں برباد نہ ہونے دے۔ ان کی دستگیری فرما تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اس لئے طوفان میں کود رہے ہیں کہ تو ڈوبتے سفینوں کو تیرانے والا ہے۔ ان کے پاس تجھے راضی کرنے کے لئے اپنی متاعِ زندگی اور عجز کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ تیرے حضور میں پیش کرتے ہیں۔"

یہ بے صوت داستان میرے ہونٹوں اور سینے کے درمیان کانپتی رہی اور میں گردوپیش سے بے خبر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ گرم گرم آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اپنی بنارگی اور عجز کا اظہار کرتے ہوئے سنگین فٹ پاتھ پر جا پڑے، غبار چھٹ گیا۔ طوفان گذر گیا اور میں نے محسوس کیا کہ کہنے والے کو جو کچھ کہنا تھا وہ بے کہے سننے والے نے سن لیا تھا اور اتنا قریب سے سنا تھا کہ شائد اتنا قرب خود کہنے والے کو اپنا بھی حاصل نہ تھا۔

(پکار)

۱۹۵۵ء

عیدِ محکوماں

عزیز دوست۔ سلام ورحمت

تمہارا عید کارڈ ملا۔ جواب میں یہ عید خط ارسال ہے۔ اگرچہ عید کارڈ کا جواب لکھنے کا رواج نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ میں مدت ہوئی ان رسوم وقیود کو نظر انداز کر کے ایک بے تکلف سادہ زندگی گزارنے کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہوں۔ اس بات کو میرے جاننے والے دور ونزدیک سے سب جانتے ہیں اور اس روش پر مجھے پختہ دیکھ کر ملامت کرنا بھی چھوڑ چکے ہوں۔ اس لئے امید ہے کہ تم بھی عید کارڈ کے جواب میں ایک سادہ خط پاکر بے لطف نہیں ہوگے۔

تم نے مجھے اپنے عید کارڈ کے ذریعے کاغذی پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا ہے میں ان کاغذی پھولوں میں سے بھی تمہارے خلوص ومحبت کی خوشبو محسوس کرتا

ہوں۔ اس کانٹوں بھری زندگی میں جو ایک مومن کو ایک غلط نظام کے تحت گزارنی پڑتی ہے، مہر و محبت کے پھول بڑی چیز ہیں۔ اس زندگی کی مسافت جیسے جیسے آدمی طے کرکے کچھ باشعور ہوتا ہے۔ اس کو یہ شعور بھی حاصل ہوتا جاتا ہے کہ اس دنیا کی سکون دینے والی چیزوں میں مقصدِ زندگی کا شعور اور بے غرض مہر و محبت دونوں بڑی قیمتی چیزیں ہیں۔ مقصدِ زندگی کا شعور انسان کو غم و آلام سے نجات دلاکر اطمینان سے بھر دیتا ہے، آدمی خالی ڈھول کی مانند نہیں رہ جاتا کہ معمولی ٹھوکر سے واویلا کرنے لگے بلکہ ایک ٹھوس وجود بن جاتا ہے جسے حوادث کی آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور مہر و محبت وہ قوت ہے جو وہ اپنے مقصدی ساتھیوں کی رفاقت سے حاصل کرتا ہے ساتھیوں کی باتیں ان کے مصافحے، ان کے معانقے۔ ان کی محبت بھری گفتگوئیں۔ ان کی بے غرض دوستیاں اور بے لوث ملاقاتیں۔ ان سب چیزوں کے درمیان آدمی اپنے آپ کو ایک لشکر کے درمیان سمجھتا ہے۔ پُر امن اور پُر سکون عزیز دوست! اس مختصر سی زندگی میں یہ متاعِ بے بہا ہے لیکن ایک بات اور ہے جس نے تمہارے عید کارڈ کی مسرت مجھ میں بڑھا دی۔ وہ یہ ہے کہ یہ کارڈ ماہِ رمضان کے یومِ جدائی کی اطلاع دینے والا پہلا پیغام ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں یہ بات کسی تقوے وغیرہ کے اظہار کی خاطر لکھ رہا ہوں بخدا ہرگز نہیں۔ میں نے اب ایسے ایسے تقوے دیکھے ہیں جن کے تقدس کی خود صاحب تقویٰ قسمیں کھاتے تھے لیکن جب انہیں غور سے دیکھا تو ان کی حیثیت کسی میلے میں بکنے والے رنگین غباروں سے زیادہ نظر نہ آئی جو اوپر سے بڑے رنگین اور خیر و خوبی کے مدعی تھے لیکن اندر ہوا و حرص کی متعفن ہوا بھری ہوئی تھی اور زمانے کی تند ہوا کے ایک جھونکے نے ہی ان کی ساری قلعی کھول دی اور وہ پھٹ پھٹا کر چیتھڑے کی طرح ایک کونے میں جا پڑے۔ الله ہر مسلمان

کو ایسے تقوے سے محفوظ رکھے اور اسے اس تقوے کی توفیق عطا فرمائے جو ہوائے نفس سے خالی ہو جو مظاہر سے اور نمود و نمائش اور ادعا سے پاک ہو جس میں اتنی ہمت ہو کہ حق کے راستے میں مشکیں کسی جائیں اور الٹا اونٹ سے باندھ کر مدینے کی گلیوں میں پھرایا جائے تو بھی اٹھ کر صاف یہی کہے کہ لوگو! سن لو۔ میں مالک بن انس ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ جبری طلاق شریعت میں وارد نہیں ہوتی جس میں اتنی قوت ہو کہ جب اس پر کوڑوں کی بارش ہو تب بھی یہ بات کہے کہ اپنی بات منوانے کے لیئے قرآن و حدیث سے دلیل لاؤ جس میں اتنا حوصلہ ہو کہ پھانسی کے تختہ پر بھی مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر چڑھ جائے کہ الہٰی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے شہادت کی سعادت نصیب فرمائی۔ چند مظاہر لباس و تراش کا نام تقوے رکھ کر اور اس کا اعلان تنہا کر کے متقی بن جانے کا یہ طریقہ اب تک چلا ہے تو انشاء اللہ کل نہ چلے گا۔ سچ کہا تھا ایک صاحب نظر نے کہ پہلے ایمان کو اپنے اندر مستحکم کرو۔ پھر اس پر عمل کر کے اور ساری زندگی اطاعت رب میں دے کر اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرو۔ ساری زندگی کا لمحہ بہ لمحہ محاسبہ کرتے ہوئے پہلو اور کسی موڑ پر بھی ٹھوکر نہ کھاتے ہوئے ہمہ تن اپنے فرائض بندگی کو ٹھیک ٹھیک اداکرتے ہوئے تقوے پیدا کرو اور پھر اپنا سب کچھ اپنے مالک کی راہ میں لگاؤ اور اس راہ حق کے غبار بن کر احسان کا مقام حاصل کرو۔ یہ کیا کہ ثابت تو اسلام بھی نہیں ہے لیکن لباس تقوے کا زیب تن کیا ہوا ہے۔

میں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ عید کارڈ نے ماہ صیام کے رخصت ہونے کی اطلاع دی تو اس سے دل کو ایک صدمہ سا ہوا۔ رمضان کی مقدس رونق کو عید کی گہما گہمی کیسے پا سکتی ہے رمضان کا چاند طلوع ہوتے ہی اس گئی گزری مسلمان

قوم کے اندر بھی زندگی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے ایک اضطراب ایک احتیاط ایک خدا خوفی ایک ذوقِ عبادت ابھر کر اس طرح سامنے آتا ہے جس طرح صبح کی شمع سنبھالا لیتی ہے اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ قوم دوسری قوموں سے کچھ مختلف ہے۔ بس یہی ایک مہینہ ہے جب اس قوم کے اندر ایک امتیازی نشان ابھرتا ہے اور پھر سال بھر کے لئے یہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ کس ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ روزوں کی احتیاط افطاری کی چہل پہل تراویح کے سجدے لمبی صفیں اور سحری کا گھر گھر چراغاں۔ یہ امتیاز اس قوم کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہی وہ برکات ہیں جو اس مہینے کو سال بھر میں عزیز ترین مہینہ بنا دیتی ہے۔ اب تک اس کے دم قدم سے کچھ نشانِ امتیاز قائم ہے۔ اس لئے تمہارا عید کارڈ گویا خود فراموشی کے ان گیارہ مہینوں کا پیغام تھا جو اس کے بعد آنے والے ہیں اس لئے رمضان کی مفارقت کے احساس نے آنکھوں میں نم آلود غبار سا پیدا کر دیا۔ سچ پوچھو تو وہ عید کہاں ہے جس کے ہم اور تم منتظر ہیں۔ عید کی تو شاعرِ اسلام نے خوب وضاحت کی ہے ؎

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے کہیں شکوہِ دین تو بڑی چیز ہے شکوہِ ملک ہی دکھاؤ۔ شکوہِ ملک جس چیز کا نام ہے وہ ہر قسم کے خارجی و داخلی اثرات سے آزاد اور پاک ملکی پالیسی ہے۔ داخلی اطمینان اور سرحدوں کی قوت و شوکت سے دوسرے ممالک میں عزت و قدر کا اونچا مقام اور قوموں کی برادری میں سربلندی اور افرادِ قوم کا اطمینانِ معاشی و معاشرتی ہے لیکن میں تو خوردبین لے کر دیکھتا ہوں اور اس چیز کو ڈھونڈتا ہی رہ جاتا ہوں پھر شکوہِ دین

یہ ہے کہ اللہ جس کے حاکم ہونے کا اقرار ہمارے ہاں کلمہ پڑھ کر راجہ بھوج سے کلوا تیلی تک کرتا ہے۔ اس کا حکم اور قانون چلے اور جس کو آقا مانا ہے اس سے انحراف نہ ہو۔ یہ عجیب مذاق ہے کہ ایک نمبردار ہے تو گاؤں کا ہر فرد اسے نمبردار بھی تسلیم کرلے اور اس کے حقوقِ نمبرداری ادا بھی کرے۔ ایک شخص ضلع افسر ہے تو ضلع بھر میں اس کی افسری کا ڈنکا بجے اور اس کے حکم سے انحراف نہ ہو۔ کوئی شخص ملک کا سربراہ ہو تو اس کا ہر لفظ سر آنکھوں پر ہو لیکن جو ہمارا حقیقی حاکمِ اعلیٰ ہے اور خود کہتا ہے کہ ان الحکم الا للہ اس کے حکم کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو اور یہ سمجھا جاتا رہے کہ اُسے بھی پرواہ نہیں ہے۔ پھر ہر طرف دین کے نشان مِٹ رہے ہوں، رقص و سرود سے شغل ہو، گانا بجانا ہو، پینے پلانے کی اجازت ہو، چوری چکاری اور بدعنوانی عام ہو۔ دینی فضا دن بدن ختم ہو رہی ہو اور جو کچھ بچا کھچا دین قوم میں صدیوں کے انحطاط کے باوجود باقی چلا آرہا ہے، اس کا بھی صفایا ہو رہا ہو۔ قوم بار بار پکارے کہ ہمیں دین کی حکمرانی اور اسلام کا قانون چاہیئے لیکن اسی کے خلاف ساری قوت اور طاقت استعمال ہو رہی ہو اور دین سے ہر قدم دور ہی جا رہا ہو۔ برسوں کا سفرِ زندگی مکہ و مدینہ کی سمت چھوڑ کر کسی اور ہی سمت لیا گیا ہو تو وہاں سکون دین کہاں سے آئے گا۔ پھر جب نہ شکوہِ ملک ہو اور نہ شکوہِ دین ہو تو پھر بندہ آزاد اور بندۂ مومن کہاں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عید کے دن ہجوم مومنین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن جانو جب سے یہ احساس پیدا ہوا ہے عید کا سارا ہنگامہ ایک بے جان ہجوم معلوم ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو گذشتہ برسوں میں سنے تو وہ عید کی ہی نہیں جو آزاد مسلمان ماہ رمضان کے کامیاب اختتام پر کیا کرتے تھے۔ لوگ ہنستے کھیلتے ہیں، پروگرام بناتے ہیں۔ تحفے تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں، عید کارڈوں کی گڈیاں لکھ ڈالتے ہیں لیکن میں ان ہنگاموں میں شریک نہیں ہوتا

صرف خاموشی سے ان کو دیکھتا رہتا ہوں جیسے ایک رہرو یتیم خانے کے ان بچوں کو دیکھتا ہے۔ جن کے ماں باپ ان کے سر سے اُٹھ گئے ہوں، لیکن وہ دعوت کھانے کے شوق میں ہنستے کھیلتے قطاریں بنائے چلے جارہے ہوں جس روز سے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ مومن کی عید کیا ہے۔ اس روز سے میری عید ختم ہوگئی ہے۔ صرف لوگوں کی بے مغز عید کو چشم عبرت سے دیکھتا ہوں اور اس چاند کے طلوع کا منتظر ہوں جو دین کی شوکت کا پیغام لے کر آئے گا اور مسلمان قومی لحاظ سے خدا اور رسولؐ سے غداری کی روش کو چھوڑ کر ان کی کُھلی اطاعت کی روش اختیار کریں گے۔ اس روز میں تمہیں عید کارڈ لکھوں گا اور اگر تقاضا کروگے تو سارے پرانے قرضے بھی چکا دوں گا۔

اس سال تو دو عیدوں کا تماشہ بھی تم نے دیکھ لیا۔ ایک دینی عید اور ایک سرکاری عید۔ مطلع صاف تھا اور چاند کہیں نظر نہ آیا لیکن رات کو ریڈیو سے سرکاری اعلان آگیا کہ کل پورے ملک میں عید منائی جائے گی۔ مسلمان حیران اور اہلِ علم پریشان کہ عید کے چاند کے بغیر عید کیسے ہوگی لیکن معلوم ہوا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اب چاند دیکھے بغیر بھی عید کرنا ممکن بنا دیا ہے تاکہ قومی اتحاد کا عظیم مظاہرہ ہوسکے۔ چنانچہ قومی اتحاد کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ ہر ہر بستی اور شہر میں لوگ دو عیدوں میں تقسیم ہوگئے سرکاری لوگوں نے ایک دن پہلے عید کرلی اور عام مسلمانوں نے علماء کے فتوے کے مطابق دوسرے روز عید کی۔ پھر سرکاری ذرائع نشر و اشاعت میں علماء کے خلاف ایک زبردست مہم چلادی گئی اور بالآخر تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کو گرفتار کرکے حوالۂ زنداں کردیا گیا۔ اس جرم میں کہ انہوں نے سرکاری تائید میں فرض روزہ ترک کرکے عید کیوں نہیں کی تھی۔ اس طرح اب حضرت مولا بخشش مذہبی امور میں منصب قضا پر متمکن ہوگئے ہیں اور تمام علماء کو مسٹر بنا کر رکھ

دیا ہے۔ اب بتلاؤ کہ جب ساری ترقی کا راز اس امر میں ہی پوشیدہ ہو جاتے کہ کرسمس کی طرح عید بھی ایک مقررہ دن سرکار کے اعلان کے مطابق کر لی جایا کرے۔ چاہے چاند نظر آئے یا نہ آئے تو کم از کم علماء کو زمانے کے اس تقاضے کا ساتھ تو بہرحال دینا چاہیے۔

اب میں کیا جانوں کہ تم نے سرکاری عید کی خوشی میں یہ عید کارڈ ارسال کیا ہے یا غیر سرکاری عید کی خوشی میں اب جب تک یہ بات صاف نہ ہو تمہارا عید کارڈ اہل علم نشر ناد کے خلاف بے علم جابر لوگوں کی اس یلغار کا ماتم کرتا ہوا مشتبہ حالت میں میری میز پر پڑا ہے۔ اور اس دن کا منتظر ہے جب اسلام کو ماننے والی قوم اپنے غیر صالح جباروں کی صدیوں کی دست برد سے نجات پائے گی۔ اس وقت تک اگر ہم عید کے پیغام مسرت کو ملتوی رکھیں تو خیریت اسی میں ہے۔

(ساتھی کے نام ۱۹۶۶ء)

ایک ایڈیٹر، ایک وزیر

ایڈیٹر گم صم بیٹھا تھا۔

مدت سے وہ اخبار کی سطروں میں اپنی رگوں کا خون نچوڑ رہا تھا کاتب کا معاوضہ پریس کا بل، کاغذ کی قیمت، بائینڈر کا مطالبہ، اور بعض اوقات تو اس کا وہ اخبار جس کا وہ خود ایڈیٹر سے لے کر چپڑاسی تک تھا۔ صرف اس لئے اٹک کر رہ جاتا کہ اس کے پاس ڈاک کے لئے پیسے نہ ہوتے۔ وہ دن بھی وہ نہ بھولا تھا جب وہ صبح سے بھوکا تھا اور اس کے گھر میں اس لئے چولھا گرم نہ ہوا تھا کہ سبزی کے لئے پیسے نہ تھے اور اس کا ایک پرانا صورت آشنا اس کے دفتر کے سامنے سے گزرا تو اس نے ایک اخبار مانگا اور اخبار لے کر اس کی قیمت ایک دوّنی میز پر رکھ دی۔ وہ اس دوّنی کو قبول کرنے سے انکار نہ کر سکا۔ اور اس دن اس دوّنی سے ہی اس کے ہاں چولھا

گرم ہوا تھا۔ اس یاد نے اسے افسردہ نہیں کیا۔ وہ یہ پرانی یاد سوچ کر مسکرا دیا۔ روپے کے غم میں شاید وہ آج تک افسردہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ روپے کے لئے انسان کا غم کرنا اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ یہ خود آتا ہے خود جاتا ہے۔ آتا ہو تو مسرت کی کوئی بات نہیں۔ جاتا ہو تو یہ کوئی غم کا موقعہ نہیں۔ اس بے حقیقت شئے کے لئے غم و مسرت کے بارے اپنے اعصاب کو تکلیف دینا کسی سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی کا کام نہیں ہے۔

چنانچہ اس دن بھی وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اور گم صم بھی اس لئے کہ وہ تنہا تھا ورنہ غم کی خاموشی اس کے پاس بہت کم آتی تھی۔ اسے کوئی غم تھا تو اپنے مقصد کا اور یہ غم اس کے تمام غموں کو نگل گیا تھا۔ پریشان خیالی کا وہ بہت کم شکار ہوتا۔ البتہ تنہائی کی خاموشی اسے پسند تھی۔ اس گم صم کیفیت میں بھی اگر کوئی آجاتا تو ایڈیٹر کے پاس ایک فراخ دل اور کشادہ پیشانی موجود تھی جن کی مدد سے وہ آنے والے کا استقبال کرتا۔

لیکن آنے والا جو آیا وہ وزارت داخلہ کا چپڑاسی تھا۔

"یہ کار سرکار" کا لفافہ لے کر اس نے چپڑاسی کی ایک کاپی پر دستخط کر دیئے اور جب وہ چلا گیا تو اس ایڈیٹر نے جسے سرکار سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو سرکار کا ایک بے رحم لیکن مخلص نقاد تھا۔ اس لفافے کو بڑے اطمینان سے چاک کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی وارننگ۔ کوئی تنبیہہ یا بندش اخبار کا حکمنامہ لیکن جو نکلا وہ اس کے علاوہ اور کچھ تھا۔

یہ ۹ مئی کی دوپہر تھی۔ جب اسے یہ خط موصول ہوا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا۔

"آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ پی۔ سی۔ سی کی حقوق کمیٹی کی میٹنگ ہے جس میں آپ کے اخبار میں وقتاً فوقتاً چھپنے والے قابلِ اعتراض مضامین پر غور کیا جائے گا۔ یہ میٹنگ ۹ مئی کو محکمہ نشر و اشاعت و اطلاعات کے پریس روم میں بروز بدھوار ٹھیک پانچ بج کر ۴۵ منٹ پر ہو گی۔ آپ سے کمیٹی کے سامنے جواب دہی کے لئے حاضر ہونے کی درخواست کی جاتی ہے۔"

اس عبارت کے نیچے کمیٹی کے کنوینر کی جگہ کسی صاحب نے نہایت جناتی خط میں دستخط فرمائے تھے۔ خط پڑھ کر اسے پتہ چلا کہ اس کمیٹی کے سامنے اس کی حاضری میں صرف تین گھنٹے باقی تھے۔ اس نے اطمینان سے لفافہ دراز میں رکھ دیا اور نماز ظہر کے لئے اٹھ گیا۔

ساڑھے پانچ بجے وہ وزارتِ داخلہ کی دو منزلہ عمارت کے قریب جا پہنچا۔ خاردار تاروں کے جنگلے سے گھری ہوئی عمارت کے پھاٹک پر اس نے چپڑاسی سے محکمہ نشر و اشاعت کا پریس روم دریافت کیا اور پھر سامنے کے زینے کی طرف چل دیا۔ جب دوسری منزل پر پریس روم کے سامنے وہ پہنچا تو اس وقت اس کی گھڑی نے بتایا کہ وہ دس منٹ قبل از وقت آ گیا تھا۔ وہ کمرے کے سامنے گیلری میں کھڑا ہو گیا۔ اسے انتظار تھا کہ کوئی چپڑاسی اس سے وہاں کھڑا ہونے کی وجہ پوچھے اور پھر اسے کمرے میں لے جائے لیکن مسلسل دس منٹ تک اس کے قریب سے گزرنے والے سرکاری لوگوں نے گویا اس کی موجودگی کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ پورے پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر وہ چک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ وہاں چند آدمی اس کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے اور پھر اس سے سوال جواب ہوں گے۔

لیکن خلافِ توقع وسیع کمرہ اس کے سامنے اپنے وسیع گدّوں اور کرسیوں کے ساتھ خالی پڑا تھا۔ وہ اطمینان سے سامنے کی ایک کرسی پر جاکر بیٹھ گیا اور اپنا سیاہ ہینڈ بیگ کرسی کے ساتھ ٹکا لیا۔ اسے حیرت تھی کہ پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر منعقد ہونے والی میٹنگ کہاں گئی تھی۔ گھڑی اب چھٹے گھنٹے کا چھیالیسواں منٹ بجانے چل پڑی تھی۔ اس نے حیرت کے ساتھ صبر وسکون کو مزید دعوت دی اور کسی نئے آنے والے کے انتظار میں وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پورے انہماک سے ایک رسالے کا تازہ شمارہ دیکھ رہا تھا جب ایک آہٹ کے ساتھ ایک شخص اندر داخل ہوا۔

وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا لیکن نیا چہرہ اس کے لئے بالکل ہی نیا نہ تھا۔ وہ صورت شناسا تھا۔ ایک مقامی ہفت روزہ درباری سے اخبار کا مسکین سا ایڈیٹر تھا۔ آنے والے نے زبان سے نہیں صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا جس کا جواب بھی ہاتھ سے ہی دیا گیا۔ آنے والا آتے ہی کرسی پر نیم دراز ہوگیا اور جب اس نے اس کی طرف تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہ اونگھ رہا تھا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اب چھ بج رہے تھے بلکہ دس منٹ زائد ہوگئے تھے۔ اسے ابھی عصر کی نماز پڑھنا تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وزارتِ داخلہ کی گھڑی ۴۵ء۵ بہت عرصے کے بعد بجاتی ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نماز کے لئے جگہ کی تلاش میں تھا۔

اس کی بے چینی کی گڑبڑاہٹ نے کرسی پر نیم دراز شخص کی آنکھوں کو نیم باز کردیا۔

"میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہاں کوئی جگہ ایسی ہے جہاں پڑھ سکوں۔"

اس نے بلند آواز میں کہا۔

"مسجدِ خضرا میں پڑھ آئیے۔ ٹائم کا فکر نہ کیجئے۔ وہ میٹنگ جس کے لئے آپ آئے ہیں سات بجے سے قبل نہ ہوگی"۔ اس نے مسکین سی آواز میں بڑی جہاندیدگی کے انداز میں کہا "بہت خوب" وہ مسکرایا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ اسے بے حد مسرّت ہوئی کہ اسے نماز کے لئے باہر جانے کا موقع مل گیا تھا آتے ہوئے اسے یہ خطرہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میٹنگ کی طوالت میں نماز کو دیر ہو جائے۔ لیکن نماز سے پہلے ہی فارغ ہونے کے احساس نے اسے بڑی فرحت دی اور اس نے ہلکا پھلکا پن محسوس کیا۔ اس کا ویسے بھی جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس ملاقات سے قبل اپنے رب کی نماز پڑھے اور اس سے گڑگڑا کر قوّتِ تقریر طلب کرے۔ قوّتِ بیان۔ قوّتِ اظہارِ بیان، وہ ملاقات سے واپس آ کر یہ نہ سوچنا چاہتا تھا کہ کاش میں نے یہ کہا ہوتا۔ یا میں نے یہ کیوں نہ کہا۔

"پھر بھی جلدی آ جائیے گا" باہر نکلنے سے قبل ہی دوسرے شخص نے اسے نصیحت کی۔

"بہتر" اور وہ سیڑھیاں اتر کر بنگلے کے پار نکل گیا۔

موٹروں کی قطاریں طے کر کے وہ زیرِ تعمیر مسجدِ خضرا میں داخل ہو گیا۔ اطمینان سے اس نے شیروانی اتاری، بیگ رکھا، ٹوپی پر عینک اتار کر رکھی۔ اور لوٹا لے کر فرش کے تازہ کٹے ہوئے پلستر سے ہٹ کر گزر گیا۔ وضو کے بعد اس نے نماز پڑھی اور بہت دنوں کے بعد اسے وہ احساس نصیب ہوا۔ جب بندگی کی لذّت ہی تمام لذائذ سے لذیذ محسوس ہوا کرتی ہے۔ جب قلب سے آسمان تک ایک سلسلۂ تارِ عبودیت معلق ہو جاتا ہے۔ اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کی پشت پر ایک قوت ہے جس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ آسمان اور زمین کے درمیان کا خلا اسے ایک قوی کی قوّت سے

معمور محسوس ہوتا ہے اور اس قوی کی قوت کو وہ اپنی پشت پر محسوس کرتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی بارگاہ اس کے سامنے اونچی نہیں رہتی، اور کوئی قوت ہوا کے ایک جھونکے سے زیادہ زور آور نہیں رہتی۔ بندہ اپنے حلق میں حق کی آواز، اپنے بازوؤں میں خالدؓ وحیدرؓ کی قوت اور اپنے قدموں میں طغرل وسنجر کی شوکت محسوس کرتا ہے اور جب بندے کو ایسی پشت پناہی حاصل ہو جائے تو پھر وہ کسریٰ کے قالینوں کو بھی اپنے نیزے کی انی سے چھیدتا ہوا گزر جاتا ہے اور قیصر کے ساز و سامان بھی اس کی بے سروسامانی پر شرمانے لگتے ہیں۔

وہ نماز سے فارغ ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ ایک چٹان اس کے سر پر تھی جو اتر گئی، ایک بوجھ اس کے قلب پر تھا جو سرور سے بدل گیا۔ اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ اسے قوت گویائی دے۔ اسے اپنی بات کہنے کی ہمت دے۔ حق بات کہنے کی توفیق دے اس سے وہ سب کچھ کہلوا دے جو حق کی پشت پناہی میں کہنا اس پر لازم ہو اور اسے باطل سے مرعوب ہونے سے بچائے۔" اس نے یہ مفہوم نہ معلوم کتنی بار ادا کیا۔ اپنے الفاظ میں حضرت موسیٰؑ کے الفاظ میں۔ یہاں تک کہ اس کا قلب پوری طرح مطمئن ہو گیا۔

مسجد خضرا کے زیر تعمیر صدر دروازے سے وہ پھر باہر سڑک پر آگیا۔ اس کی گھڑی چھ بیس بجا رہی تھی۔ وہ تیز تیز چل کر خاردار جنگلے میں داخل ہو گیا۔ چوکیدار نے اسے اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا اور پھر اپنے ایک ساتھی سے باتیں کرنے لگا۔ اب احاطے میں موٹریں پہلے کی نسبت کم ہو گئی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا پریس روم میں چلا گیا۔

خالی کمرہ گویا اس کے انتظار میں ہی تھا وہ اطمینان سے اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی

پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہی مسکین سا ایڈیٹر جسے وہ اونگھتا چھوڑ گیا تھا، کمرے میں داخل ہو گیا اور آکر اپنی پہلی جگہ بیٹھ گیا۔

"کیا آپ کو بھی کمیٹی کے سامنے بلایا گیا ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"جی"

"دیکھئے کمیٹی میں وزیر صاحب بھی موجود ہیں۔ ابھی آپ کو بلایا جائے گا۔ میری بات سنیئے۔ بالکل بحث کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ جو کچھ کہیں "جی حضور غلطی ہو گئی" کہئے اور یہ بھی کہ "آئندہ ایسا نہ ہوگا" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔" اور ہاں، ان کو بالکل محسوس نہ ہو کہ آپ سرکش یا ضدی ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ جو کچھ کہیں خاموشی سے سنئے اور کچھ نہ کہئے بس اسی میں فائدہ ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں" انہوں نے مزید سمجھایا۔

"جی ہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور گھبرانے کی بات ہو بھی کیا سکتی ہے؟" ایڈیٹر نے کہا۔

"ہاں لیکن انہیں یہ یقین دلا دیئے کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، یہ غلطی ہو گئی ہے اور یہ دیکھئے" انہوں نے اپنے یا تصویر اخبار کا ایک فائل کھولا جس میں جگہ جگہ تمام وزرا کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔

"میں نے کبھی کوئی بات نہیں کی، نہ معلوم پریس برانچ نے کیا شکایت کر دی۔ بہر حال واحد نسخہ یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں جو کچھ کہیں۔ یہ کہیں کہ غلطی ہوئی آئندہ نہ ہوگا۔ بس پھر کوئی فکر نہیں۔"

وہ سمجھا ہی رہے تھے کہ کمرے کی چق اٹھی اور ایک چپڑاسی کمرے میں داخل ہوا۔

"جہانِ نو کے ایڈیٹر آئے ہیں" اس نے کہا۔

"جی" ایڈیٹر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"آپ کو وزیر صاحب نے کمرے میں بلایا ہے"۔ اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ایڈیٹر اٹھا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ چپڑاسی ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جاکر یوں کھڑا ہو گیا کہ جیسے ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

کا خطرہ سامنے ہو۔ اس نے سپرنگ دار دروازہ کھول دیا اور ایڈیٹر اندر داخل ہو گیا۔ کھٹ سے دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا۔ بے اطمینانی سے پھڑکنے والا دل اطمینان سے اپنی جگہ پر آ گیا۔ کمرے میں سامنے چند قدم کے فاصلے پر بے ترتیب سے انداز میں کچھ نشستیں تھیں، تین کرسیاں دائیں طرف تھیں۔ ایک کرسی نیم بائیں پہلو پر تھی۔ ایک کوچ سامنے پڑا تھا اور کوچ اور تینوں کرسیوں کے آخری سرے پر ایک بنچ بچھی ہوئی تھی، تینوں کرسیوں پر تین آدمی اکڑوں سے انداز میں نیم مؤدب بیٹھے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھ کر بھی اپنے قریب بیٹھنے والوں میں سے کسی کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ادب اور احترام کی حدود کے وہ پوری طرح پابند ہیں اور انہیں پھاندنے کی جرأت وہ اپنی کسی حرکت سے نہیں کر سکتے۔ ان میں دو مقامی روزناموں کے ایڈیٹر تھے، اور ایک غالباً کسی خبر رساں ایجنسی کا نمائندہ تھا۔ نیم بائیں پہلو کی کرسی پر وزیر صاحب تشریف فرما تھے، گرمیوں کے سادہ سے ہلکے پھلکے انگریزی لباس میں، بشرے سے زیادہ ذہانت نمایاں نہ تھی۔ چہرہ اکثر تصویروں میں نظر آنے والے حلیے سے کسی صورت بھی زیادہ مختلف نہ تھا، ایک سادہ غیر ذہین اور بے وقار چہرہ، سامنے کے کوچ کے بائیں پہلو میں ایک سانولے سے رنگ

کا تپلون پہنے ہوئے ایک شخص بیٹھا تھا۔ جسے وہ پوری طرح جانتا تھا۔ یہ دارالخلافہ کے سب سے زیادہ چھپنے والے انگریزی روزنامے کا ایڈیٹر تھا۔ باربار سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے روکھے روکھے سے خدوخال اور بے وقار سے انداز اور حرکات۔ آخری سرے پر بچھی ہوئی بنچ پر دو حضرات تشریف فرما تھے جن کا انداز خالص سرکاری اور دفتری تھا۔ ان میں سے ایک وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری تھے اور دوسرے کوئی ان کے مددگار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں موٹی موٹی فائلیں تھیں۔ یہ جیوری بیٹھی تھی۔ جب یہ مجرم عدالت کے کٹہرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم" ایڈیٹر نے داخل ہوتے ہی کہا۔

اور پھر اس نے دیکھ لیا کہ اس کی نشست سب سے زیادہ چھپنے والے انگریزی روزنامہ کے ایڈیٹر کے بائیں پہلو میں کوچ کے دائیں طرف تھی۔ وہی ایک سیٹ تھی جو خالی تھی اور اس نے وہی قوت اپنی ٹانگوں میں محسوس کی جو اس کے آباد اجداد میں سے انہوں نے محسوس کی تھی جو کسریٰ کے دربار میں گئے تھے اور اپنے نیزے کی انی سے قالین چھیدتے ہوئے گزر گئے تھے۔

وہ بھی مضبوط قدموں کی دھمک کے ساتھ چل کر سامنے کے کوچ پر بیٹھ گیا۔

"کیا آپ ہی جہانِ نو" کے ایڈیٹر ہیں؛ وزیر صاحب نے پوچھا۔

"جی"

"کیا جہانِ نو کسی سیاسی جماعت کا پرچہ ہے" انہوں نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں۔ پرچہ میرا ہے۔ اور میں ایک دینی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں" ایڈیٹر نے کہا اور یہ کہتے ہوئے ایک ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر آگیا۔ لیکن سامنے کی تین کرسیوں

نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اپوزیشن کو جب ہمارے ہاں اتنی ڈھیل ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے مقاصد کے لئے جائز ذرائع استعمال کرے"۔ وزیر صاحب نے کہا۔

"یقیناً جہاں تک جائز ذرائع کا تعلق ہے ان کا ان لوگوں سے زیادہ طالب اور کون ہوگا جو ملک میں اخلاقی قدروں کو ابھارنا چاہتے ہیں"۔ ایڈیٹر نے کہا۔

گفتگو کا دھیا دھارا صرف انہیں دونوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ باقی حاضرین بالکل ممیوں کی طرح اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔

"دیکھئے صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم جائز ذرائع استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسا نہیں کرتے"۔ وزیر صاحب نے اردو روز نامہ اخباروں کے نمائندوں کے مجمعوں کی طرف مخاطب ہو کر بالکل اس انداز میں کہا جیسے انتہائی ڈپلومیٹک طریقے سے انہوں نے کسی مجرم سے اقرار جرم کروا لیا ہو۔ جواب میں خاموش ججوں نے صرف آنکھیں جھپکا کر اپنی زندگی اور سماعت کا ثبوت دیا لیکن خاموش رہے۔

"جناب پہلے تو یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ آپ کے نزدیک کون سے ذرائع جائز ہیں اور کون سے ناجائز پھر یہ نشان دہی بھی فرمایئے کہ ان ناجائز ذرائع میں سے کون کون سے ذرائع ہیں جو ہم اختیار کئے ہوئے ہیں"۔

ایڈیٹر نے بات کو ڈھب پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ کم از کم آپ لوگوں کو تو ان گندی سیاسیات سے پاک ہونا چاہیئے مثلاً کسی پر الزام لگانے سے"۔ وزیر صاحب نے ذرا رک کر کہا۔ انہوں نے غالباً محسوس کیا کہ یہاں ڈپلومیٹک انداز کا کوئی قدردان نہیں ہے۔

"کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم بھی ان ناجائز ذرائع کو استعمال کرتے ہیں"۔
ایڈیٹر نے جان بوجھ کر گفتگو میں گرمی، قوت اور زیادہ وضاحت پیدا کرنے کے لئے یہ پوچھ لیا۔

"کیوں نہیں"، وزیر صاحب نے ایڈیٹر سے نظر ہٹا کر زندہ مجسموں کی طرف پھر دیکھتے ہوئے کہا تا کہ وہ بھی اس شہادت حق میں شریک ہوں۔

"اگر آپ کا واقعی یہی خیال ہے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ ہمیں بالکل نہیں جانتے اور ہمارا قریبی مطالعہ آپ نے نہیں کیا ہے حالانکہ آپ ہی سب سے بہتر پوزیشن میں تھے کہ ملک بھر کی جماعتوں کو قریب تر سے دیکھ کر اُن کے متعلق صحیح ترین اندازہ لگا سکیں۔ میں آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں گا۔ کہ آپ ہمارے نظریات کا نئے سرے سے مطالعہ کیجئے"۔

ایڈیٹر نے بے تکان جواب دیا۔
وزیر صاحب ذرا خاموش ہو کر بولے۔

"لیکن کسی پر الزام لگانا اسلام میں کہاں تک جائز ہے۔ کیا یہ ناجائز ذریعہ نہیں ہے؟"
الزام لگانا تو عام اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی مکروہ حرکت ہے۔ ہمارے نزدیک تو پاک مقاصد کے لئے پاک ذرائع ہی اختیار کئے جا سکتے ہیں"۔ ایڈیٹر نے کہا۔

"پھر آپ کے اخبار میں یہ کیوں شائع ہوا ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں کی مرضی سے حکومت ہوتی ہے"۔ وزیر صاحب نے کہا۔

"ذرا مجھے دکھا دیجئے"، ایڈیٹر نے سیکرٹری صاحب کی طرف دیکھا جن کی گود میں ایک موٹی سی فائل رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے الٹ پلٹ کر ایک مضمون نکالا۔ یہ نو ماہ قبل چھپا

ہوا ایک افسانہ "گُل رُخ" تھا۔

"کیا یہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے؟" سیکرٹری نے پوچھا۔

"میں اس اخبار کا ایڈیٹر ہوں اور ایڈیٹر کے دیکھے بغیر اخبار میں کوئی چیز نہیں چھپا کرتی۔ یہ افسانہ میرے ذہن میں پوری طرح موجود ہے۔ آپ اعتراض بیان فرمائیے" ایڈیٹر نے کہا۔

"یہی ہے کہ ہمارے ملک میں ایک عورت کی مرضی سے کام ہوتا ہے۔" وزیر صاحب نے کہا۔

ایڈیٹر نے محسوس کیا کہ وزیر صاحب کے ذہن میں جو عورت تھی اس کی وضاحت کرنے سے وہ خود کترا رہے تھے۔ انہوں نے پھر کہا۔

"آپ خود محسوس کر سکتے ہیں کہ قاری کا ذہن کدھر جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ناجائز ذریعہ ہے۔"

ایڈیٹر کے تحت الشعور میں ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ بیچارے کس مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ ایک ملک کی وزارت داخلہ ملک کی ایک عورت کے خلاف سوچے جانے والے خیالات پر احتساب کرنے کے لیئے ذہنوں کا تجزیہ اور قلموں کا جائزہ لینے بیٹھی تھی۔ کتنی بے چارگی اور بے بسی تھی۔ جس ملک کی لاکھوں خواتین کی آبرو اس لیے محفوظ نہ تھی کہ ان کے لیے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی جہاں لاکھوں بھوکے اور ننگے اپنی عزتِ نفس سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ جہاں اس قوم کے نظامِ حیات اسلام کی دن رات توہین ہوتی تھی وہاں کی وزارتِ داخلہ خوردبین لگا کر بیٹھی تھی کہ لوگوں کے ذہنوں اور قلموں کو کھنگال کر دیکھے کہ ان میں کہیں ایک مخصوص ہستی کی شان میں گستاخانہ

الفاظ استعمال کرنے کی نیت موجود تو نہ تھی۔ یہ قانون اور اخلاق اور بلند مناصب کی کتنی بڑی توہین تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید یونانی تہذیب کا وہ دور آگیا تھا جس میں حکومت کے اکابرین کے محبوب مقامات فاحشات کے اڈے ہوتے تھے۔ کیا یہ نمرود کی خدائی کا دور تھا؟

"میں آپ حضرات پر نہایت اختصار سے ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں جس کا فرق نہ جاننے کی وجہ سے آپ اس کشمکش میں گرفتار ہوتے ہیں"

ایڈیٹر نے حاضرین میں اپنی کم عمری کے باوجود پورے استادانہ انداز میں کہا۔

"افسانے اور رپورتاژ میں فرق ہوتا ہے۔ ادیب اپنے ادب کے لئے مواد اور اس مواد کے ساتھ کردار اپنے معاشرے اور سوسائٹی میں سے ہی لیتا ہے۔ نہ آسمان سے اترتا ہے اور نہ کسی خواب و خیال کی دنیا سے لاکر وہ اپنے کرداروں میں زندگی کا خون دوڑا سکتا ہے۔ جب وہ افسانہ مرتب کرتا ہے تو معاشرے کے کسی مقام سے وہ پھول چنتا ہے اور کہیں سے وہ خار فراہم کرتا ہے کسی برائی کے خلاف رائے عامہ کو تیار کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی معاشرے میں سے لے کر پورے بھیانک انداز میں پیش کرتا ہے اور کسی نیکی کو تقویت دینا چاہتا ہے تو اس کے خدوخال بھی وہ معاشرے میں ہی پوری طرح نکھار کر دکھاتا ہے اور اس سارے مواد کو جمع کر کے اپنے مقصد کے مطابق وہ ڈھالتا ہے اور جس تصورِ حیات کو وہ اُجاگر کرنا چاہتا ہے اس کے کرداروں کو نمایاں کر دیتا ہے اور جس کو دبانا چاہتا ہے اس کے کرداروں کی برائیوں اور خامیوں کو ابھار دیتا ہے۔ اب جس کمزوری یا برائی کی اس نے مذمت کی ہے اور اسے دبانے اور اس کے خلاف جذبۂ نفرت ابھارنے کی کوشش

کی ہے۔ اس کمزوری کا حامل کوئی شخص آکر کہے کہ تم نے میرے خلاف یہ افسانہ لکھا ہے اور تم الزام تراشی کرتے ہو اور تم نے فلاں فلاں باتیں میرے بارے میں زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کی ہیں، تو ظاہر ہے اس شخص کی حماقت ہو گی اور اس پر چور کی ڈاڑھی میں تنکے والی مثال صادق آئے گی۔ افسانہ نویس بیچارہ اتنا ہی کہے گا۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں میں نے تو معاشرے کی فلاں برائی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ مجھے تم سے یا تمہارے کسی دوسرے بھائی سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ یہی حال افسانے کی اس عورت کا ہے جس کے کردار کو آپ خواہ مخواہ کسی جگہ چسپاں کر کے دیکھتے ہیں اور فٹ پاتے ہیں تو افسانہ نویس سے جواب طلبی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ آپ نے جب افسانے کا یہ سانچہ لے جا کر اپنی کسی محترم ہستی پر رکھ کر اسے ناپنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس خیال سے کہ یہ سانچہ تو اسی کے لئے موزوں ہے تو آپ خود ہی اس کی توہین کے مرتکب ہو گئے۔ گویا یہ خیال آپ کے دل میں پہلے سے موجود تھا کہ اس قسم کا سانچہ تو ہماری فلاں محترم ہستی پر ہی پورا اتر سکتا ہے"

ایڈیٹر کی گفتگو کو سارے حاضرین پوری خاموشی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ اس نے ذرا رک کر پھر کہا۔

" دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ افسانہ ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ افسانے کے کردار فرضی ہوتے ہیں۔ فرضی نہ بھی ہوں تب بھی فرضی سمجھے جاتے ہیں اور فرضی کرداروں پر کبھی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ افسانے سے کبھی کوئی الزام تراشی کی شکایت نہیں کرتا البتہ رپورتاژ ایسی چیز ہے کہ اس پر گرفت ہو سکتی ہے۔ وہ سچے کرداروں کے صحیح ناموں کے ساتھ اصلی مقامات پر ہونے والے بعض سچے واقعات کی پوری پوری ادبی انداز میں تفصیلی

روداد ہوتی ہے ۔ وہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی کانسٹیبل کسی حادثہ کی روداد لکھتے۔ اسی طرح ادیب کسی واقعہ کا رپورتاژ لکھتا ہے ۔ ایسے حالات میں ادیب کی دیانت، امانت یا فہم اور نیت کو چیلنج کیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ جب تک آپ افسانے اور رپورتاژ کا فرق ملحوظ نہ رکھیں گے ۔ آپ کے لئے ادبی احتساب مشکل ہو جائے گا ۔ ایڈیٹر نے بالآخر بات ختم کی ۔

" آپ کی وضاحت اور تشریح کا میں ممنون ہوں لیکن میں پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔" وزیر نے کہا۔

" اطمینانِ قلب اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ میرا کام تو یہ ہے کہ اصلی پوزیشن واضح کر دوں۔ میری گذارش ہے کہ آپ ہمارا مزید مطالعہ کریں اور ہمیں سمجھیں" ایڈیٹر نے کہا۔" ہاں ایک اور بات ہے وہ یہ ہے کہ آپ ساری قیادت کو بُرا کہتے ہیں ۔ شرابی اور راشی کہتے ہیں۔ حالانکہ کیبنٹ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شراب بالکل نہیں پیتے اور رشوت نہیں لیتے۔

" یس یس ۔ ۔ ۔ ہاں مولانا آپ ساری لیڈر شپ کو بُرا کہتے ہیں ۔ کیا یہ الزام نہیں ہے ؟ یہ ان فیئر مینز (UN FAIR MEANS —) نہیں ہے ؟ کیا آپ اس طریقے سے اسلام کو لائیے گا ؟ کیا آپ کا یہ اسلام ہے ؟ اگر ایسا اسلام ہے تو ہم کو ایسے اسلام کی ضرورت نہیں ہے ۔"

میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کو اچانک دورہ سا پڑ گیا ۔ اس نے خالص اداکارانہ انداز میں ہاتھ نچا نچا کر نہایت بھونڈے اور شوریلے سے انداز میں باتیں کیں ۔ اتنے زور زور سے کہ مجلس کا سارا وقار اور سنجیدگی ختم سے ہو گئے ۔ اور محسوس ہوا کہ جیسے کوئی ٹھامی اچانک غصے میں آ گیا ہے یا دیہاتی تھانیدار کے ہاتھ میں کوئی نیا مرغا پھنس گیا ہے۔

اس نے پھر زور زور سے کش لگاتے ہوئے دھواں چھوڑا اور کہا۔

" سب لیڈرشپ کو خراب کہتا ہے۔ کیا سارا کیبنٹ خراب ہے؟ ان کو شرابی اور راشی کہنا ان اسلامک نہیں ہے؟

اس طرح اپنے دل کا دھواں نکال کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی گفتگو نے ایڈیٹر کو محسوس کرایا کہ اس غلط سلط بولنے والے کے ذہن میں اسلام کسی چپڑاسی کا نام تھا جسے رکھنے یا ڈسچارج کر دینے کا وہ اپنے آپ کو پوری طرح مجاز سمجھتا تھا۔ ایڈیٹر کے لئے مشکل تھا کہ وہ اس مکروہ غلط فہمی کو اس کے ذہن میں رہنے دیتا۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ اسے اب اس محفل میں اسلام کے لئے بات کرنا تھی۔

" دیکھئے صاحب" ایڈیٹر نے نہایت سنجیدگی سے اپنی آواز کو ذرا ابھار کر کہا" یہاں چند سنجیدہ آدمی بیٹھے ہیں جو سنجیدگی سے چند مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ آپ کو چاہیئے کہ ایک سنجیدہ محفل میں سنجیدگی سے بات کرنا سیکھیں"

یہ کہہ کر ایڈیٹر ذرا رُکا ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے پھر کہا" دوسری بات یہ کہ اسلام آپ کو نہیں چاہیئے تو عرض ہے کہ اسلام آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے کا محتاج نہیں ہے۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں۔ وہ اس ملک کے لئے مقدر ہو چکا ہے اور وہ آکر رہے گا اس لئے بہتر ہے کہ آپ اسلام کی آمد کا زیادہ غم نہ کریں" ایڈیٹر نے کہا۔

انگلش روزنامے کا مدیر خاموش ہوگیا۔ کمرے میں ایک سکوت سا چھا گیا صحافی میتوں نے حیرت سے ایڈیٹر کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر صاحب بولے۔" دوسری بات یہ ہے کہ آپ قیادت کو راشی اور شرابی کہتے ہیں حالانکہ کیبنٹ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شراب نہیں پیتے"

ایڈیٹر نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات اپنا نام لئے بغیر گویا صرف اپنے بارے میں کہہ رہے تھے۔ اس جملے نے اس کے موڈ کو پھر نرم کر دیا۔ اور اس میں شدت اور سختی کا انداز جو آ گیا وہ دھیما پڑ گیا۔

" میرے محترم " ! ایڈیٹر نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

" ہم قیادت کو واقعی نا اہل راشی اور شرابی کہتے ہیں لیکن کیبنٹ یا اس کے افراد کو مخاطب کرنا ہمارا اصول نہیں ہے ۔ آپ کبھی نہ دیکھیں گے کہ ہم نے افراد کو مخاطب کیا یا نشانہ بنایا ہو۔ البتہ قیادت ایک ہئیتِ اجتماعی کا نام ہے اور کسی فرد کا نام نہیں ہے۔ جب ہم قیادت کو نا اہل کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ موجودہ نظام چلانے والی وہ ساری مشینری جو صدر مملکت سے لیکر ایک معمولی چپڑاسی تک کام کر رہی ہے۔ اوور ہال کئے جانے کی محتاج ہے ۔ حالانکہ ان میں بعض اہل بھی ہو سکتے ہیں ۔ جب ہم اسے شرابی یا راشی کہتے ہیں تو ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ان میں سے ہر فرد شرابی یا رشوت خور ہے بلکہ یہ کہ اس کا اجتماعی خمیر ایسا ہے کہ اس میں رشوت اور شراب پرورش پاتی اور پروان چڑھتی ہے اور ہم اسی کو بدلنا چاہتے ہیں "

زندہ مجسمے خاموش بیٹھے تھے ۔ انگریزی روزنامے کا مدیر بے چینی سے کوچ پر پہلو بدل رہا تھا۔

" کوئی اور بات ہے " وزیر صاحب نے سیکرٹری کی طرف دیکھ کر کہا۔

" دیکھئے یہ [illegible] صاحب کی نظم کے [illegible] تین بند ہیں " انہوں نے فائل کا ایک دوسرا صفحہ [illegible] کر ایک [illegible] دکھایا۔

یہ نظم انتخابات کے بعد لکھی گئی تھی اور شاعر نے قوم کو مخاطب کیا تھا۔

" یہاں بھی وہی بات ہے کسی فرد کی بات نہیں ہے۔ مجموعی طور پر قیادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور قیادت کسی فرد کا نام نہیں اور نہ ہی قیادت کوئی مقدس گروہ ہے کہ جس کے لئے تقدس و بزرگی کے تمام حقوق محفوظ ہوں جو باتیں ہم آپ دل میں جانتے ہیں وہ شاعر نے زبان سے کہہ دی ہیں۔" ایڈیٹر نے کہا۔

انگریزی روزنامے کے مدیر نے بالآخر بے چین ہو کر وزیر سے کہا۔

" میں بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔ ایک جگہ ٹینس میچ میں جانا ہے اب بس کیجئے۔"

" بہتر ہو کہ آپ ذرا احتیاط رکھیں۔ آخر تقوی کا بھی یہی تقاضا ہے۔"

سیکرٹری صاحب نے نہایت سنجیدگی اور آہستگی سے کہا۔

" بہت بہتر" دراصل تقوی کا مفہوم ہی ہمارے نزدیک یہ ہے کہ خدا کا خوف سب خوفوں پر غالب ہو اور اس کے حکم کو دوسرے تمام خوفوں سے بے نیاز ہو کر پہنچا دیا جائے۔" ایڈیٹر نے کہا۔

" پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔"

سیکرٹری صاحب نے مزید ہمدردی کے انداز میں کہا۔

" احتیاط کرنا تو ہمارا فرض ہے اور ہر ممکن احتیاط ہم کرتے ہیں اس لئے کہ ہمارا فرض تبلیغ ہے۔ لیکن جتنی احتیاط ہم کرتے ہیں کوشش کریں گے کہ اس سے بھی زیادہ ہو۔"

ایڈیٹر نے کہا۔

" اچھا مولانا صاحب۔ میں چاہتا تھا کہ آپ سے بات پوری طرح سمجھوں۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکا۔" وزیر نے کہا۔

" میری دلی خواہش تھی کہ میں اپنی بات پوری وضاحت سے بیان کر سکتا۔ ہو سکتا ہے

کہ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہو جہاں تک سمجھنے سمجھانے کا تعلق ہے۔ مجھے جب کبھی موقع ملے میں ہر وقت اس لئے حاضر ہوں "

ایڈیٹر یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

السلام علیکم کہہ کر وہ دروازے کی طرف چل دیا اور کھٹ سے دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا۔

اس ملاقات سے گمان تھا کہ شاید اس کا پرچہ اب بند نہ ہوگا، لیکن پورے ایک ماہ بعد اسے احکام مل گئے کہ سیفٹی آرڈیننس کے تحت اس کا اخبار، چھ ماہ کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔

(تصویریں۔ ۱۹۵۱)

احتجاج

(ایک سیاسی مظاہرے کا رپورتاژ)

وزیرِ اعظم کا جہاز رات کو آٹھ بجے آنے والا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ چار گھنٹے لیٹ تھا۔ اب اس کا بارہ بجے انتظار تھا۔

اور کراچی شہر کے عوام اپنی وارفتگیٔ جنون کا اظہار کرنے کے لئے ایئر پورٹ پر جمع تھے۔ ایک غیر مطمئن اضطراب فضا میں لہریں لے رہا تھا اور ایک بے چین طوفان سینوں میں بپھر رہا تھا۔

اسٹار گیٹ سے ایئر پورٹ بلڈنگ تک سڑک کے دو طرفہ ایک سو بائیس تار کے کھمبے تھے۔ جن میں چھپا سٹھ فلڈ لائٹ پوسٹ تھے۔ ہر کھمبے پر بجلی کی لمبی لمبی فلور سنٹ لائٹ ٹیوب لگی ہوئی تھیں جن کی تیز روشنی میں پتنگوں کے سائے تک نظر آتے تھے لیکن انہیں کھمبوں کے نیچے چھپا سٹھ طوفان پوشیدہ تھے۔ کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ تھوڑی

دیر میں اس سڑک پر احتجاج کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مارنے والا تھا۔ سنجیدہ۔ متین اور یادگار طوفان۔ زندہ۔ پرجوش، اور باعزم طوفان۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ کھمبوں کے ان روشن سایوں میں متفرق مقامات پر جو معزز شہری بکھرے بکھرے سے بیٹھے مطالعہ یا گفتگو کررہے تھے، یہ کتنے بڑے انقلابی، کتنے سرفروش، اور کتنے مجاہد تھے۔

آئینی جدوجہد کے اس دور میں احتجاج کا بھی ایک ناظم تھا، اور وہ ناظم اسٹار گیٹ اور ایئرپورٹ بلڈنگ کے درمیان دو چکر لگا چکا تھا۔ سب کچھ تیار تھا، اور اب بھی صرف اسی کا انتظار تھا جو آٹھ بجے رات کے بجائے اب بارہ بجے رات آرہا تھا۔

ایئرپورٹ کے احاطہ میں پولیس گردش کررہی تھی، اور طبعِ نازک پر کسی ناخوشگوار گمراہی کے امکانات سونگھ رہی تھی، لیکن وہاں تو مختلف نوجوان ٹولیوں میں ادھر سے ادھر ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بنیرز لئے بیٹھے گفتگو کررہے تھے۔ اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ ان کے ہاتھوں میں لپیٹے ہوئے بنیرز ملفوف طوفان تھے جو کھلنے پر آفت ڈھانے والے تھے اور آنے والے کے عوامی لیڈری کے خوابِ مقبولیت کو پریشان کردینے والے تھے۔

سب کے کام کے مقامات متعین تھے۔

گیلری میں آدمیوں کا اضافہ ہورہا تھا۔ لکڑی کے جنگلے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی باڑھ لگ گئی تھی۔ اور اب ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

"اب اس فضا کو آنے والے واقعہ سے مانوس ہوجانا چاہئیے تھا" ناظم نے سوچا۔ ایئرپورٹ کے اندرونی احاطے کے تمام کارکنوں کو جو بیس گروپوں پر مشتمل تھے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے بنیرز کھول سکتے تھے۔

اور اچانک یہاں سے وہاں تک کلیاں سی کھل گئیں. سفید سفید بینرز سُرخ حروف کے ساتھ ہوا میں لہرانے لگے۔

"مظلوموں کو رہا کرو"

"جمہوریت کا خون نہ کرو"

اس سرے سے اس سرے تک فضا ان خاموش نعروں کی فضا سے معمور نظر آنے لگیں. جو ابھی سینوں میں گنگ، پڑے تھے۔

ائرپورٹ، کی گیلری میں بھرے ہوئے سارے ہجوم نے محسوس کیا کہ فضا میں کوئی چیز چھائی ہوئی سی تھی، حاضرین نے ہڑبونگ کی بجائے اپنے آپ کو ایک غیر محسوس نظم کے تحت محسوس کیا، ایک احساسِ نظم، ایک احساسِ سنجیدگی، ایک احساسِ ذمہ داری سارا ماحول پر چھایا ہوا تھا۔

اور گھڑی کی سوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

گیلری کے ساتھ ساتھ مختلف ٹریڈ یونینوں اور انجمنوں کے جھنڈے عوامی احتجاج سے تعاون کر رہے تھے، اور لوگ اس گوشے پر ٹوٹے پڑتے تھے. جس طرف ائیرفیلڈ کے اندر میز کرسی اور ہار طرّہ کا انتظام کیا گیا تھا اور جہاں سرکاری اہتمام سے استقبالیہ کمیٹی کے صدر وزیر اعظم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے والے تھے. جہاں کیمرہ مستعد کھڑا تھا کہ وزیر اعظم کے ساتھ فوٹو کھینچی جائے، تاکہ اخبارات کو بھجوائی جا سکے. اس گوشے میں بینڈ بھی مستعد کھڑا تھا، پولیس نے بھی سارا علاقہ اندر اور باہر سے پوری طرح گھیرا ہوا تھا۔

اور احتجاجی بینر اس مقام پر بہت آگے بڑھ کر لہرا رہا تھا، پولیس کا ایک سپاہی بیتاب

ہوگیا، اور حقِ نمک ادا کرنے کے لئے بینر پر جھپٹا اور سمیٹ کر لے گیا۔ ناظم کے پاس یہ شکایت پہنچی لیکن اب وقت تحقیق و تفتیش کا نہ رہا تھا۔ احتجاج کے اندر ایک دوسرا احتجاج اب ممکن نہ تھا۔

اور پھر اچانک ایئرپورٹ بلڈنگ کے اندر سے گیلری کی طرف بڑھتی ہوئی وہ دو قطاریں نمودار ہوئیں جو خود ساختہ قیادت کو عوامی بنانے کا عارضی نسخہ بن کر آئی تھیں یہ کباڑی اور ناتھا خان گوٹھ کے پٹھان چوکیدار اور مزدور درآمد کئے گئے تھے، بیڑیاں پیتے ہلکی ہلکی سرگوشیاں کرتے ایک مصنوعی نظم کے تحت اُلٹی سیدھی دو قطاروں میں آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی سینما کے سامنے کی قطاریں استقبالیہ کمیٹی نے کرائے پر لے لی تھیں یا مزدوروں کے کسی ٹھیکہ دار سے ٹھیکے پر عوامی قیادت کے استقبال کے لئے عوام فراہم کئے گئے تھے۔ کرائے کے یہ حاضرین جو (ٹرکوں میں لائے گئے تھے) دیکھ کر احتجاج کرنے والوں کو ایک الجھن سی ضرور ہوئی، اور یہ دو قطاریں کئی منٹ تک بلڈنگ کے تنگ راستے سے نمودار ہو کر گیلری میں جمع ہوتی رہیں اور وہاں سے انہیں اس کوتے کی طرف لے جایا جاتا رہا جہاں وزیر اعظم کا استقبال کرنے کے لئے کالی پتلونیں، سفید کوٹ، کیمرہ، بینڈ، ہار، طرّے ۔ ——————

پولیس کے بہت سے باوردی اور بے وردی افسر اور دیگر سرکاری لیڈران کرام کھڑے تھے اب اس سرے پر ایک بے تحاشا ہجوم ہو رہا تھا اور پولیس حسبِ معمول ڈنڈے ہلا رہی تھی۔ احتجاجی بینرز گیلری کے تمام احاطے میں بیس کی تعداد میں مساوی طور پہ بٹے ہوئے تھے اور پوری مستعدی سے ہوا میں لہرا رہے تھے اور پھر مشرق سے ایک گونج سنائی دی اور دُور فضا میں بتیاں نمودار ہوئیں، سب نگاہیں اس طرف متوجہ تھیں وہ آیا، وہ

اترا اور وہ شدید شور اور گھر گھراہٹ کے ساتھ رن وے کا چکر لگا کر چیختا اور دہاڑتا ہوا گیلری کے عین سامنے بینڈوں، کیمروں اور نیم سرکاری استقبالیہ ہجوم کے قریب آکھڑا ہوا اور وہ اس میں سے نمودار ہوئے۔

لیکن جب نمودار ہوئے تو گیلری میں ایک آگ سی لگ گئی، یہ آگ ان جذبات میں لگ گئی تھی جو بہت عرصے سے سلگ رہے تھے۔ جنہوں نے مفکرِ اسلام کی سزائے موت کی خبر سن رکھی تھی اور جسے اب چودہ سال قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

کیا ان کا جرم تفہیم القرآن کی تفسیر مرتّب کرنا تھا۔

کیا ان کا جرم تحریکِ اسلامی کے ذریعہ مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور ملک میں اسلامی دستور کا مطالبہ پرپا کرنا تھا۔

کیا ان کا جرم "راست اقدام" کے ہنگاموں سے من حیث الجماعت علیحدہ رہنا تھا؟

ان جرائم کے سوا تو ان کا جرم آج تک سننے میں نہ آیا تھا جس پر انہیں سزائے موت دی جا سکتی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ قیادت کے نزدیک ان کا کونسا جرم زیادہ سنگین تھا

بہرحال اس طیارہ کی آمد پر ان جذبات میں آگ لگ گئی جو پہلے سے زخمی تھے۔

اور آخر اس زخم سے کون نہیں کراہ رہا تھا۔ کیا ایک عامی سے لے کر مفتی امین الحسینی تک نہیں چیخ پڑے تھے؟ کیا پورے ملک میں صفِ ماتم واحتجاج نہیں بچھ گئی تھی؟ کیا تاروں کی کثرت نے ٹیلیگراف آفس کے عملے کو بوکھلا نہیں دیا تھا؟ کیا ملک کی فضا میں غم نہیں تیر رہا تھا، کیا یوں محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کے قلب پر ایک زبردست چوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا ایک حزن، ایک غم، ایک الم، ایک اضطراب، ایک بے چینی، ایک یاس فضا میں نہیں گھل گئی تھی؟ کتنے لوگ تھے جو اس صدی کی المناک ترین خبر سننے کے

کے بعد سارا سارا دن روتے رہے تھے۔ کتنے تھے جو مٹھیاں بھینچتے رہے تھے۔ کتنوں نے اپنے جذبات کے سامنے ضبط کے ہمالے کھڑے کر رکھے تھے حالانکہ وہ اپنی جانوں کو راہِ خدا میں بیچ چکے تھے اور جن کی جانیں اس خبر کے بعد ان کے جسموں میں تنگی سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ قفس میں آزاد پرندے کی طرح۔

لیکن جب وہ طیارہ آیا جس میں وزیرِ اعظم آئے تھے تو پھر جذبات میں وہ آگ لگ گئی جو آذربائیجان کے تیل کے کنوؤں کی آگ سے زیادہ خطرناک تھی، مظلوموں کے منہ سے ایسی چیخ بلند ہوئی جو ڈائنامیٹ کے دھماکے سے زیادہ تیز و شدید تھی۔ ایک رَو آئی اور ضبط کے سارے ہمالے بہ گئے۔ جہاز گیلری کے سامنے کھڑا ہوا گھر گھر کر رہا تھا۔ اس کے پٹ کھلنے ہی والے تھے، استقبالیہ کمیٹی کے ارکان اپنی ٹائیوں کو درست کر رہے تھے، کیمرہ زاویئے بدل رہا تھا۔ بینڈ سلامی دینے کے لئے پر تول رہا تھا۔ درآمد کردہ حاضرین کو نعروں کا اشارہ ملنے ہی والا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی کا صدر جیب میں آخری بار سپاسنامہ ٹٹول رہا تھا اور لاؤڈ سپیکر جو وزیرِ اعظم کے الفاظ گرانمایہ کو لیے تاب ہجوم تک پہنچانے والا تھا اپنا رُخ بدل ہی رہا تھا۔ اور پٹ ابھی کھلے نہ تھے کہ۔۔۔۔ اچانک اس ہجوم میں سے جو اس کونے میں سمٹ آیا تھا ایک آواز بلند ہوئی۔

"مفکرِ اسلام کو رہا کرو۔ اسلام کی امانت کو واپس کرو۔"

یہ آواز تھی ایک چیخ تھی، ایک پُر درد صدا تھی، ایک پُر شور احتجاج تھا۔ ضبط کا بند تھا جو بھک سے اُڑ گیا تھا، لیکن نہیں یہ تو جوالا مُکھی کا پہلا خروج تھا۔

اس لئے کہ پھر اس کے بعد انسانی قلوب میں ایک زلزلہ آ گیا۔ یہ نعرہ اور زیادہ قوت سے بلند ہوا۔ بارش کا وہ پہلا قطرہ تو موسلا دھار بارش کا صرف پیش خیمہ تھا، بلکہ ایک

خوفناک طوفان کا۔ گیلری کے چاروں طرف سے مختلف نعرے بلند ہوئے اور چند لمحوں میں
سارا ہجوم نعروں سے اُبل رہا تھا۔

اب پورا ہجوم نعروں سے اُبل رہا تھا۔

ناظم پر دباؤ تھا کہ انہیں بھی نعرے کی اجازت دی جائے جو منتظم مظاہرین تھے۔
ناظم پر دباؤ تھا کہ گیلری کے متفرق حصّوں سے اس مخصوص گوشے کی طرف سمٹ
آنے کی اجازت دی جائے۔

اجازت دے دی گئی۔

اس شرط کے ساتھ کہ نعرے میں حدودِ اخلاق کا پورا لحاظ رہے۔ نظم وضبط ٹوٹنے
نہ پائے۔

اور پھر وہ طوفان بھی جو گیلری کے مختلف حصّوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس مقام
کی طرف سمٹ آئے جو اس وقت انسانی حیات کا زندہ آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ لیکن ان
کا سمٹاؤ بھی دل آویز تھا۔

پٹ کھل چکے تھے اور وزیرِاعظم جہاز سے اتر کر لاؤڈ سپیکر کے قریب آچکے تھے۔ اور
ادھر سے یلغار بڑھ رہی تھی۔

گیلری کے دوسرے سرے سے ایک دستہ چلا یہ طلبہ کا تھا۔ چار چار کی قطاروں میں،
پریڈ کی شکل میں، ہاتھوں میں بنیرز، ایک کے کندھے پر دوسرا سوار کئی ایک کے شانوں
پر ایک طالب علم کھڑا ہوا آگے آگے تھا، اور وہی اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا۔
ایک نظم وضبط، لیکن انتہائی وارفتگی کے ساتھ یہ دستہ اس گوشہ کی طرف بڑھ رہا تھا
جہاں وزیرِاعظم کے استقبال کا سامان جمع تھا۔

" مفکرِ اسلام کو رہا کرو۔ جمہوریت کا خون نہ کرو"

آوازیں بڑھ رہی تھیں، نیز و تند نعرے بڑھ رہے تھے اور یہ دستہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا ہجوم کو دباتا ہوا گیلری کے اس کٹہرے سے جا لگا جہاں وزیر اعظم کے سامنے سپاسنامہ پڑھا جا رہا تھا۔

اس استقبال میں شامل ہونے والا وہ بینڈ ماسٹر بھی جانتا ہے کہ سپاسنامے کے الفاظ خود لاؤڈ سپیکر کو بھی سنائی نہیں دے رہے تھے،

اور اس کے بعد ادیبوں کا ایک گروپ بھی پوری متانت لیکن وارفتگی سے نعرے لگاتا ہوا اس گوشے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ یہی گوشہ ہدفِ احتجاج تھا۔ ان ادیبوں میں بڑے بڑے شاعر، طنز نگار، افسانہ نویس، مدیرانِ کرام اور نقّاد تھے۔ سبھی اس احتجاج میں شریک تھے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک نئے ادب کا سوتا بند ہوا جا رہا تھا۔ نئے افکار پا بہ زنجیر تھے۔ نئے تخیلات کو پھانسی دی جا رہی تھی، نئی شاہراہِ زندگی کو باڑھ ماری جا رہی تھی۔ نئے زمانے کا نیا انسان جو ایک قدیم انقلاب کو نئے روپ میں لے کر ابھر رہا تھا اس کا راستہ روکا جا رہا تھا۔ اُسے چودہ سال کا بن باس دیا جا رہا تھا۔ ادیب اپنے فن کے غدّار ہوتے اگر احتجاج کے لئے جمع نہ ہوتے۔ وہ بھی بلند نعروں کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تحریروں کی ساری قوت ان کی آوازوں میں سمٹ آئی تھی ان میں بھی بعض بعض کے کندھوں پر سوار تھے وارفتہ احتجاج اپنے لئے یونہی راستہ نکالا کرتا ہے۔

اور نعرہ بلند ہو رہا تھا۔

جمہوریت کا خون نہ کرو"

ان کا یہ نعرہ بتا رہا تھا کہ ادیب بالکل تیار نہ تھے کہ ان کی زندگی میں جمہوریت کا خون بہا دیا جائے۔ وہ صریرِ خامہ سے بڑھ کر فلک شگاف نعرے تک لگا سکتے تھے یہ ان کی اپنی زندگی کا معاملہ تھا جس سے وہ ادب اخذ کرتے تھے۔ وہ بازارِ ادب کے سودا باز ادیب نہ تھے، ان ادیبوں کے نزدیک میرِ کارواں سے محرومی گویا متاعِ حیات سے محرومی تھی، اور وہ جو اپنے ادبی اجتماعات میں بلند آوازسے بات کرنے کو بھی خلافِ آداب سمجھتے تھے، یہاں اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت اور اپنے گلوں کی پوری فراخی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔

ادیبوں کا دستہ بھی سمٹ کر، سکڑ کر ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہو کر گیلری کے ساتھ ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اور نعرے پوری قوت سے لگ رہے تھے۔

اور پھر یہ وبا عام ہو گئی۔

سب لوگ بھول گئے کہ کیمرے کس مقصد کے لئے لائے گئے تھے۔ خود استقبالیہ کمیٹی کے ارکان بھول گئے کہ بینڈ کا کیا مصرف تھا؟ لاؤڈ اسپیکر کس مرض کی دوا تھا؟ پولیس کیے دست دیا تھی، پھول اور ہار اور طرّے محرومِ زیبِ گلو تھے۔

اور اب وہ ظالم کرائے کے درآمد کردہ حاضرین بھی ماحول کی فضا میں بہ گئے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ انہیں کن نعروں کے لئے بلایا گیا تھا۔ کس مقصد کے لئے بارہ میل دور سے ان کو ٹرک اٹھا کر لائے تھے؟ اور ان کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ بس وہاں تو ایک ہی نعرہ تھا جو مسلسل بلند ہو رہا تھا۔ احتجاج کے سیلاب میں وہ بھی بہ گئے تھے۔

اوپر سے نیچے تک، دائیں سے بائیں تک، آگے سے پیچھے تک، ایک ہی نعرہ ایک

، ہی سودا، ایک ہی جنون، ایک ہی آواز، انسانی احتجاج کا ایک ہی پُرشوکت مظاہرہ۔

اور اب لوگوں نے خود بخود دو گروپوں کی شکل اختیار کر کے اس نعرے کو کورس کی شکل دے لی تھی۔

ایک گروپ کہتا تھا "مفکرِ اسلام کو۔"

اور دوسرا گروپ چیختا "رہا کرو۔"

اس طرح نعرے بے اثر و بے معنی نہ تھے، لگانے والے بھی اس کے مفہوم سے پوری طرح آگاہ تھے، اور سننے والے بھی سمجھ رہے تھے کہ جو لوگ یہ نعرے لگا رہے تھے۔ وہ کرائے کے دل و دماغ نہیں رکھتے تھے

لاؤڈ اسپیکر پر بہت کچھ شور و غل کے بعد یہ سمجھ میں آیا کہ وزیرِ اعظم ہجوم سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ ذرا خاموش ہو جائے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

مظاہرین کے سربراہ کاروں نے بڑی مشکلوں سے آوازوں کو ذرا دھیما کیا تاکہ پتہ چل سکے کہ "عوامی لیڈر" نے اس سے متاثر ہو کر کیا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم مظاہرین کے جذبات سے بے نیاز مجلسِ استقبالیہ کے سپاسنامے کا جواب ارشاد فرما رہے تھے، وہی بندھی ٹکی باتیں جو شاید پہلے سے تیار تھیں، گویا ان کو خبر بھی نہ تھی کہ ان کے سامنے کیا ہو رہا تھا۔ آہ! یہ اندھی، بہری اور گونگی قیادت، ان کے چند الفاظ ہی سے ہجوم ان کی بات سمجھ گیا، اور اس خفیف سی رکاوٹ کے بعد آتش فشاں نے پھر لاوا اگلنا شروع کر دیا، اور پھر یہ ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر پر چیخ چیخ کر وزیرِ اعظم اپنی بات فرماتے رہے اور عوام اپنی۔ کسی نے کسی کی سن کر نہ دی، یوں عوامیت کا غبارہ پھٹ گیا۔

اب پولیس نے لاٹھیوں کی مدد سے وزیرِ اعظم کے لئے راستہ بنانا شروع کیا تاکہ وہ

ائیرپورٹ بلڈنگ ہی سے گزر کر موٹر تک جا سکیں، یہ رُخ دیکھ کر مظاہرین نے بھی ادھر کا رُخ کیا اور اس طرح وہ سارا مظاہرہ مجسم اپنی ساری قوت، ساری آتش فشانی، سارے شور و شغل، اور سارے بہاؤ کے ساتھ بند بلڈنگ میں منتقل ہوگیا۔ وہ وقت مظاہرے کے عروج کا انتہائی وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کے دامن میں کسی عظیم چٹان کو ڈائنامیٹ لگا کر اڑایا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی سمندری جزیرے کے اندر اچانک کوئی جوالا مکھی پھٹ پڑا تھا۔ بند بلڈنگ، گھٹن اور انسانوں کے بے پناہ شور و غل مچاتے ہوئے ہجوم نے ایک مضطرب چیخ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ گویا آوازوں کی اس اجتماعی قوت کے زور سے وہ عمارت یک سے اُڑ جانے والی تھی۔

طلبہ نے کاروں کو گھیر لیا تھا۔ انہوں نے ایک اور نعرہ لگایا:۔

"ملوکیت مُردہ باد"

لیکن مظاہرین کے کارکنوں میں سے ایک نے انہیں تادیب کی۔

۔ اِدھر اُدھر نہ بھٹکو، اصل موضوع سے نہ ہٹو۔ اس نے تنبیہہ کی اور وہ سنبھل گئے۔

اب نعرے وبا کی شکل میں اختیار کرگئے تھے۔ اب یہ نعرہ پھیل کر سارے ماحول کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اب یہ بہتا ہوا سیل تھا، ایک طوفان، ایک تند و تیز دھارا تھا جو ائیرپورٹ بلڈنگ سے سٹار گیٹ تک بہہ رہا تھا۔ اب آگ وہاں بھی لگ چکی تھی۔ ناظم چند منٹ قبل دوڑتا ہوا بلڈنگ سے اسٹار گیٹ تک گیا تھا اور اس نے اشارہ کردیا تھا کہ وہ وقت آگیا تھا جس کے تم کئی گھنٹے سے منتظر تھے

اور پھر اچانک ہر لیمپ پوسٹ کے نیچے مظاہرین کا ہر ایک گروپ بینر لئے کھڑا نظر آتا تھا، دُور تک انسانوں کے کھیت کی طرح جو اچانک زمین سے اُگ آئے تھے۔ جرچار منٹ

پہلے کہیں نہ تھے اور اب چند منٹ بعد ہر کہیں تھے۔ سڑک کا چپہ چپہ سراپا احتجاج تھا۔ احتجاج کی لہریں ایک میل کے علاقے میں سمندر کی لہروں کی طرح امڈ رہی تھیں۔ ہر کار کے آنے پر جوار بھاٹا کا منظر کھنچ جاتا۔ اس طرح کاروں کے اس کارواں کا استقبال ایک میل تک ہوتا تھا، کہ ہر چند قدم پر روشنی کے کھمبے کے پاس فلڈ لائٹ کے عین نیچے ایک لہراتا اور پھڑ پھڑاتا بینر اور نعرے یاد دلاتے تھے کہ وہ شخص محض ایک گوشت پوست کا انسان نہیں ہے۔ وہ تو اس ملک کے قلب کی دھڑکن ہے، اس ملت کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ اس قوم کے لئے پہاڑی کا چراغ ہے، وہ امید کی کرن ہے ۔۔ وہ پیغامبرِ بہار ہے۔ وہ تمنائے دل ہے، وہ شمعِ آرزو ہے، وہ نشانِ منزل ہے۔ وہ آنے والے انقلاب کا داعی اور رہنما ہے۔ وہ ایک نظریہ ہے، ایک اصول ہے، ایک تحریک ہے، اسے تم ملک سے چھین نہیں سکتے۔ تم تقدیر کے فیصلے بدل نہیں سکتے۔ تم نوشتۂ دیوار مٹا نہیں سکتے۔ تم پوری ملت کی آواز کو دبا نہیں سکتے۔ تمہاری ساری گھن گرج کو ملت کی یلغار اپنی گونج میں دبا سکتی ہے۔ تمہاری جڑیں ملت کے سینے میں پیوست نہیں ہیں۔ تم پانی میں تیرنے والی کائی ہو۔ تم درخت کے ٹوٹے ہوئے پتے ہو، تم لہروں میں اٹھنے والا حباب ہو، تم ملت کے شعور اور قلب سے بہت دُور ہو۔ اور احتجاج کا سمندر ایرپورٹ بلڈنگ سے اسٹار گیٹ تک لہریں لے رہا تھا۔ پے بہ پے نَو بہ نَو، لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا، اور پھر وہ کاروں اور ٹرکوں اور بسوں اور موٹروں والے بھی ان کے ہم نوا تھے اور اسی طرح نعرے لگاتے جا رہے تھے۔

"مفکرِ اسلام کو رہا کرو"

لیکن وہ نہ آیا جس کا انتظار تھا اور جس کے استقبال کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ وہ اس سیدھے راستے پر نہ آیا، وہ عوامی احتجاج کی تاب نہ لاتے ہوئے پیچھے کے راستے سے نکل گیا تھا۔

"عوامی مقبولیت سے کامیاب پسپائی" ایک آواز سنائی دی۔ (تصویریں، ۱۹۵۳ء)

مَیں اور میرا سایہ

میرے ساتھ اس کے بہت گہرے تعلقات ہیں ۔ اگرچہ میں نے اُسے آج تک نہیں دیکھا، لیکن وہ ہمیشہ میری تاک میں رہتا ہے۔ میری باتیں سننے کا شوقین اور میری آمد و رفت اور نقل و حرکت سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ کئی سال سے میرے ساتھ اس کے روابط ہیں مجھے وہ چھُپ چھُپ کر دیکھتا ہے اور اس نظارے سے اس کا جی کبھی نہیں بھرتا۔ بارہا ایک عنبر بانو بس اور اجنبی چہرے کا نقاب اوڑھ کر وہ مجھے ملا ہے۔ میری مجلسوں میں بیٹھا ہے۔ مجھ سے باتیں کیں اور میرے قریب رہا ہے۔ لیکن میں نے اس کے دل کے چور پر کبھی نظر نہیں کی، ایک دھڑکتے ہوئے دل، ایک مجرم ضمیر، اور ایک محجوب چہرے اور انداز کے ساتھ وہ کتنی ہی بار میری راہ میں آیا ہے لیکن میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ایسی حالت میں وہ کیوں مبتلا ہے۔ لیکن اس کا یہ شوق کہ وہ میری ایک ایک بات سے آگاہ رہے۔ دن بدن بڑھتا

ہی جارہا ہے۔ کئی سال سے اسے میرے ساتھ دلچسپی ہے۔ اور اس کی یہ دلچسپی بڑھتی جارہی ہے، جہاں میں گیا وہ میرے ساتھ رہا۔ اتنے دنوں کے دیرینہ یکطرفہ تعلقات کے باوجود اس کی جھجک دُور نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح شرماتا، کنی کاٹتا لیکن مکھی کی طرح میرے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

کیا اسے میرے ساتھ کوئی انس پیدا ہوگیا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ بیچارہ تو اپنے پیٹ کی خاطر میرے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیٹ کے مسئلے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اسے جو کچھ میرے ساتھ دلچسپی ہے وہ ان چند سکوں کی وجہ سے ہے جو اس کا آقائے نامدار ہوا راسے دیتا ہے۔ گویا وہ جبری عشق ہے جو اُجرت لے کر کسی سے کیا جارہا ہے۔

ایک بار ان صاحب کو شبہ ہوا کہ میں نے انھیں پہچان لیا ہے۔ وہ میرے پاس آئے۔ سخت جھینپتے، شرماتے اور لجاتے ہوئے جیسے عین چوراہے پر کسی کا ستر کھُل گیا ہو اور آکر انہوں نے اپنی کتھا بیان کرنی شروع کردی، پیٹ کی مجبوریاں، بڑے خاندان کا بوجھ معاشی اُلجھن، اسلام کا درد، دین سے گہری دلچسپی، اپنے ڈیپارٹمنٹ میں دین کی تبلیغ اور اس کے لئے دفتر میں بحثیں اور آخر میں پیٹ کی مجبوری اور زمانہ کی خرابی اور مصلحت

میں نے انھیں تسلی دی کہ آپ اس قدر پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ آپ اپنا کام کریں ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ جو باتیں بعد میں ندامت پشیمانی اور شرمندگی کا باعث ہوں ان کو اختیار نہ کرنا چاہیئے اور اگر اختیار کیا ہے تو پھر یہ ندامت اور پشیمانی ایک جھوٹا فعل ہے۔

اس کے بعد جب تک وہ میرا سایہ رہے ہمیشہ خوشامد آمیز ندامت کے ساتھ میرے آگے پیچھے رہے۔ پھر معلوم ہوا کہ میرا سایہ اب دوسرے رُوپ میں ہے۔ مجھ سے ملتے ہوئے

گھبراتا ہے۔ میرے احباب سے میرا ذکر سنتا اور میرے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے اور ایسا مجنوں ہے کہ اس کتے سے بھی بات کرنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ جو میرے دروازے کے سامنے سے گزر جائے۔

وہ دن رات میرے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے لیکن اس کی معلومات کبھی مکمل نہیں ہوتیں۔ میرے ذکر سے اسے عشق ہے۔ اور اس ذکر میں بڑی پُراسراریت ہوتی ہے، وہ میرا ذکر کچھ اس انداز میں کرتا ہے، اور میری کچھ ایسی خبرگیری رکھتا ہے۔ جیسے کسی ڈاکو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

میں جب کبھی سفر پر گیا تو وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا اور میرا اندازہ ہے کہ جہاں جہاں سورج کی روشنی جاتی ہے وہاں میرے ساتھ میرا سایہ بھی جاتا ہے۔

وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اور میں اسے بالکل نہیں پہچانتا، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اس کے لئے ایک محسوس و مشہود انسان ہوں، اور وہ ایک چھلاوہ ہے جو بے شمار رُوپ رکھتا ہے۔ کبھی کسی مجلس میں اور کبھی کسی مجلس میں، جب کبھی جلسہ ہوتا ہے تو اکثر اسے بڑھ بڑھ کر دریاں بچھاتے، اور کارکنوں کی طرح کام کرتے ہوئے بھی پایا گیا ہے۔ لیکن جب وہ اس روپ میں ہوتا ہے تو بھی اس کا باطن اس کے ظاہر میں جھلکتا ہے جیسے وہ ہزار پردوں کے اندر رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ کبھی اپنا نقاب اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نقاب میں اگر اس پر شک بھری نظر بھی ڈالی جائے تو وہ "سوئے ظن گناہ ہے" کی ڈھال لے کر آگے بڑھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا کام تو انسانوں سے ہے۔ سایوں سے نہیں ہے اس لئے میں ہمیشہ اسے نظرانداز کر دیتا ہوں۔ البتہ ایسی حالت میں جب کبھی وہ پایا گیا ہے تو میں اُسے غیر محسوس طور پر

سیّدنا عیسیٰ علیہ السّلام کا ایک قول ضرور جپا دیا کرتا ہوں کہ" مومن سانپ سے زیادہ ہوشیار اور کبوتر سے زیادہ بے ضرر اور معصوم ہوتا ہے"

اور میرا خیال ہے کہ اس بات کو وہ بھی سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو سب سے بڑی مشکل ہے وہ یہ ہے کہ وہ میرا سایہ بنایا گیا ہے اور یہ اس کے فرائض میں سے ہے کہ میرا سایہ بنا رہے۔ ایسے موقعوں پر اس کی مجبوری بڑی قابلِ رحم اور اس کی بے ضمیری سخت نفرت انگیز ہوتی ہے۔ میں جب ملک کے مشرقی حصّے میں گیا تو گویا اس کے دو کے بجائے چار کان ہو گئے اور چاروں کھڑے ہو گئے، دو کے بجائے چار آنکھیں ہو گئیں۔ اور اگرچہ وہ آنکھیں اسے مجھ سے دوچار کرنے کی ہمت تو نہ ہو سکی البتہ وہ زیادہ پھٹ گئیں اور پُر جستجو ہو گئیں۔ جب میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا مطالعہ کرتا یا ہمارے مکان کے برآمدے میں اجتماع ہوتا تو وہ سامنے گلی میں چبوترے پر آ کر بیٹھا کرتا اور گلی کے کسی آدمی سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتا لیکن اس کی آنکھیں چوری چوری ادھر جھانکتی رہتیں۔ اپنی زبان سے وہ بات کسی دوسرے سے کرتا لیکن وہ اپنے کان پورے طور پر ادھر متوجہ رکھتا۔ مجھے اس کی ان حرکات پر ہنسی آیا کرتی۔ لیکن وہ اپنی ان حرکات سے کبھی باز نہیں آتا۔

جب میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے رفقاء سے ملنے جاتا ہوں تو وہ سخت بے چینی سے اسٹیشن پر دائیں بائیں ٹہلتا ہے۔ ٹکٹ خریدتے ہوئے میرے قریب کھڑا رہتا ہے۔ تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اور کبھی کبھی تو خود بھی عجیب بے تُکے اور سخت بے ربط انداز میں پوچھنے کی کوشش کیا کرتا ہے کہ" میں کہاں جا رہا تھا" اگر بتا دوں تو اس کے سوالات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، اور اگر جھڑک دوں تو سخت نادم

ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے، اتنا صبر و استقلال، اور پھر اتنی بے ضمیری و بے حسی کا صرف اسی کا حصّہ ہے،

میں جب گھر سے باہر ہوتا ہوں تو وہ ہمارے گھر پر آتا ہے۔ اس وقت اس کی حیثیت میرے کسی شناسا کی ہوتی ہے۔ وہ آکر بڑی معصومیت سے معلوم کرتا ہے کہ میں کہاں ہوں، کدھر ہوں، کس جگہ گیا ہوں، کب آؤں گا؟ کیا پروگرام ہے؟ یہ باتیں فاروق سے معلوم ہو جائیں تو فبہا۔ ورنہ وہ دروازہ تک کھٹکھٹا کر پوچھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب اس کے سوالات بھانپ کر ڈانٹ دیا جائے تو پھر خاموشی سے پلٹ جاتا ہے۔ گویا یہ تو اس کے مقدر کا جزو ہے۔

ہر جگہ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ کون لوگ ہیں جو میرے ساتھ ہیں، جو جگہ جگہ میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ جن سے میں ملتا ہوں۔ جو میری آمد و رفت کا سبب بنتے ہیں جو میری رہائش کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ بے وقوف بھی بہت ہے۔ وہ اس کی بجائے کہ خود عقل سے سمجھے یا مشاہدے سے جانے، یا کھلے اجتماعات میں شریک ہو کر صورت حال معلوم کرے، وہ ادھر ادھر سے کن سوئیاں لیتا ہے، ادھر اُدھر سے پوچھ پوچھ کر اپنی پوزیشن مشکوک کرتا ہے، اور جو معلومات اسے ذرا سی عقل استعمال کرنے اور ذرا سا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے وہ پہاڑ کھودتا رہتا ہے۔ وہ کبھی ناک سیدھی طرح سے نہیں پکڑتا، ہمیشہ الٹے طریقے سے پکڑتا ہے۔ ہمیشہ اُلٹے پاؤں چلتا ہے ہمیشہ کھیر کی وضاحت کرنے کے لئے بگلے کی مثال دیتا ہے۔ وہ عقل کا اندھا ہی نہیں بلکہ گانٹھ کا پورا بھی ہے۔

میں کسی جگہ دیہات میں جاتا ہوں تو وہ بے چارہ بھی سائیکل پر دھکّے کھاتا ہے۔

جگہ جگہ گھومتا ہے۔ سردی کی راتوں اور برسات کے دنوں میں ٹھٹھرتا اور تربتر ہوتا ہے۔ مجھے ہر جگہ رہائش کے لئے جگہ میسر آتی ہے۔ اس لئے کہ میں اپنے بھائیوں کے پاس جاتا ہوں، اسے میسر نہیں آتی کہ وہ محض ایک سایہ ہے۔ اس کی کوئی شخصیت نہیں۔ ذات نہیں، واقفیت نہیں، کسی کو اس سے دلچسپی نہیں۔ چنانچہ سردی کے دنوں میں پبلک اجتماعات کے بعد وہ سخت اضطراب اور بے لبسی کی حالت میں پایا گیا ہے اگر وہ انسانی شکل و صورت میں نہ ہوتا تو ہر شریف کسان اسے پکڑ کر کانجی ہاؤس میں دے دیتا۔

یہ کام چور بھی بہت ہے کیوں کہ اس کا کام ذلت آمیز ہے۔ پھر نوکری کا کام ہے تنخواہ کم ہے۔ ندامت اور مسلسل ضمیر کے کچوکے الگ پریشان کرتے ہیں۔ اس لئے وہ کام چوری بھی بہت کرتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ کسی جلسے کی رپورٹ دے، لیکن جلسے کے وقت وہ تاش کھیلتا رہتا ہے۔

ارے یار جلسے میں جا رہے ہونا؟ واپسی پر مجھے بھی بتا دینا کہ کیا کیا ہوا، کس نے کیا کہا اور کتنی حاضری تھی؟ وہ اپنے محلے کے کسی آدمی سے کہہ دیتا ہے۔ اور کبھی تو اس سے بھی گزر کر وہ جلسے سے واپس آنے والے سے کیفیت معلوم کر کے اپنی رپورٹ اور اپنائی۔ لے بل تیار کر لیتا ہے اسے اپنی ملازمت میں سب سے زیادہ دلکش چیز اپنائی۔ لے بل معلوم ہوتا ہے اور اسی میں وہ سارے گھپلے کرتا ہے۔ یہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا میدان ہے۔

کبھی کبھی وہ ہماری دعوت کے ایک متاثر کے روپ میں تشریف لاتا ہے، کسی کارکن پر اپنی ہمدردی جتاتا ہے۔ پھر اس کی معرفت اپنا کام نکالتا اور اپنی بہی خواہی کا یقین دلاتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تحریک کے نئے نئے متاثرین کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس لئے کہ یہی اس کی اصل چراگاہ ہے۔ یہاں وہ اپنے سارے رعب و جلال کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ ملازمتوں کا خوف، گرفتاری کا ڈر، خلافِ قانون سرگرمیوں کی دھمکی، پولیس کی نگرانی، اور نہ معلوم کتنے کتنے خوف کے شیطانوں کا لشکر سمیٹ کر وہ اس چراگاہ میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی کے بارے میں اسے رُکن ہونے کا علم ہو جائے تو پھر وہ اس پر اپنا خوف کا طلسم زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ رکن کے لفظ سے وہ لاحول سے شیطان کی طرح بھاگتا ہے۔ رُکن کو وہ ایسی سخت چٹان سمجھتا ہے جس پر اس کا ناخنِ تدبیر ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن گڑ نہیں سکتا۔

اسے سب سے زیادہ دلچسپی میرے خطوط سے ہے۔ یہ اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے اس کے دستِ مبارک تک گئے ہوئے خطوط کو میں فوراً پہچان لیتا ہوں۔ ان پر اس کی گندی انگلیوں کے نشان ہوتے ہیں۔ اس نے ان کو سخت غیر ذمہ داری سے کھول کر نہایت بھدے طریقے سے چپکایا ہوتا ہے۔ چپکانے کے لئے گوند اس کثرت سے لگایا ہوتا ہے کہ خط کا کاغذ لفافے کے فلیپ سے چپک کر رہ جاتا ہے اور پھاڑے بغیر نکل نہیں سکتا یہ گویا اس کے معائنے کی مہر ہے، جو لازماً ہر لفافے پر ہوتی ہے۔ جو خطوط میں اپنی بیوی کو لکھتا ہوں۔ اپنے بیٹے کو لکھتا ہوں، اپنے بھائیوں کو لکھتا ہوں، اپنے والدین اور عزیزوں کو لکھتا ہوں، ان سب کو وہ مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور میں اسے اس مُردار خوری سے کسی صورت روک نہیں سکتا۔ جب کبھی کوئی خط لکھتا ہوں تو جانتا ہوں کہ ہم دو کے درمیان ایک تیسرا بھی ہے جو شیطان کی طرح تاک لگائے بیٹھا ہے، اور جو جھانک جھانک کر میرے خلوت کدوں کو بھی دیکھتا رہتا ہے، جس کی فطرت مسخ ہو گئی ہے، اور جسے انسانیت

کا معمولی اخلاق بھی چھوڑ گیا ہے۔ اب میں اپنی بیوی کو خط لکھتے ہوئے بھی ایک تیسرے غیر محرم کی موجودگی کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہوں۔ وہ میرے خطوط کو پڑھتا ہے۔ جی چاہتا ہے تو انہیں منزل تک جانے دیتا ہے، اور جی چاہتا ہے تو راستے میں ہی غائب کر دیتا ہے پھر وہ خطوط اپنے احباب میں بیٹھ بیٹھ کر سناتا ہے۔ ان کا مذاق اڑاتا ہے، ان پر ہنستا ہے، اور کھلی جگہوں اور تھانوں میں بیٹھ بیٹھ کر ان پر ریمارک کرتا ہے۔ میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صرف صبر کرتا ہوں اور انسانیت کے لئے مکمل آزادی کے دن کا انتظار کرتا ہوں۔

(تصویریں)
۱۹۵۵ء

مسٹر فلاں کے نام

بنامِ آں کہ اُو نامے نہ دارد

"مسٹر فلاں صاحب ....!!

سرکارِ عالی مدار آپ کی عارضی نوکری کو مستقل کرے، اور پنشن ملنے تک ترقیوں پر ترقیاں مارنے کا چانس ملتا رہے۔

میں آپ کا نام نہیں جانتا۔ پھر بھی آپ کی ذمہ دارانہ حیثیت سے پوری طرح آگاہ ہوں چونکہ آپ کو مجھ سے کچھ نہ کچھ تعلقِ خاطر ہے اسی بنا پر یہ خط لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں جن لوگوں کے درمیان ناواقفیت یا احترام کے پردے حائل ہوں۔ وہ باہمی مکرمی و محترمی کے القاب سے ایک دوسرے کو مخاطب کر سکتے ہیں، میں بھی ایسا ہی کرتا لیکن ایک تو آپ جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان ناواقفیت کا پردہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہمارے تخاطب

میں یہ انداز تکلف ہو۔ اس لئے کہ آخر میری وہ کون سی حرکت ہے جس سے آپ ہرگز ہی
آگاہی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ، دوسرے کچھ اس لئے بھی کہ مجھے یہ پتا نہیں
معلوم ہوتا کہ کس کی "دعوت حق" جیسے معروف الفاظ کو رسوا کروں۔ جن ناگفتہ بہ فرائض سے آپ
کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بارے آپ کا اپنا بھی کچھ نہ کچھ تاثر ہے۔

چنانچہ میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ آپ کو مخاطب کرنے کے لئے کون سا لفظ استعمال
کروں، بہت غور و خوض کے بعد میں نے آپ کے لئے "مسٹر فلاں" کا لفظ تجویز کیا ہے۔
"مسٹر" کا لفظ اس لئے کہ یہی وہ کلاس ہے جس کی حفاظت بہبود اور تعمیر و ترقی کے لئے
آپ دن رات فکر مند رہتے۔ تانے بانے بنتے اور تدابیر لڑاتے ہیں۔ اور "فلاں" کا لفظ
میں نے (SO AND SO.) کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ یہی طریقہ آپ کے
ہاں رائج ہے۔ ان ابتدائی سطور کے بعد مجھے آپ سے چند باتیں نہایت اختصار سے
عرض کرنا ہیں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ میرے اس خط کے علاوہ اور کتنے ہی میرے خطوط
ہوں گے جو آپ کے سامنے پڑے ہوں گے جنہیں پڑھنا اور ایک اچھا خاصا تحقیقی کام آپ
کو سرانجام دینا ہے۔ اس کے علاوہ میری اردو کی خط و کتابت بھی آپ کے لئے آفت جان
ہے جسے سمجھنے کے لئے آپ کو کبھی اس کی خوشامد اور کبھی اس کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ پھر
چونکہ آپ نہایت فرض شناس ہستی ہیں۔ اس لئے آپ میرے نام آنے والے جرائد،
اخبارات اور کتب کے پارسل تک کا جائزہ لینا اور ان کا مطالعہ فرمانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قانون
کی روح نہ سہی تو کم از کم اس کے الفاظ تو اس کا سختی سے مطالبہ کرتے ہیں۔

آپ کے نام یہ خط لکھ کر اگرچہ میں آپ کو بھی اس خطرے میں مبتلا کر رہا ہوں کہ آپ
پر بھی کوئی "دوسرا آدمی" متعین کر دیا جائے لیکن ایسے خطرات کو آپ کی قسمت پر چھوڑ کر

یہ خط لکھ رہا ہوں۔

پہلی گذارش یہ ہے کہ آپ میرے خطوط کو بہت زیادہ دن تک اپنی جیب میں لے کر نہ پھریں، ابھی ابھی ایک خط مجھے ستر میل کے فاصلے سے چھتیس روز کے بعد ملا ہے اور تقریباً روز کا یہی حال ہے۔ یہ مانا کہ آپ کو قانونی پناہ حاصل ہے اور ڈاک خانے والوں کے ساتھ بھی یہی انتظام ہے کہ مقامی ڈاک خانے کی مہر لگنے سے پہلے خطوط آپ کے حوالے کئے جائیں تاکہ جب آپ خط اپنی مرضی سے واپس کریں تو اس وقت ڈاک کی مہر لگے اور سارا الزام درمیانی فاصلے کے انتظامات پر جا پڑے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ جس شخص کو مستقل تاخیر سے خطوط مل رہے ہوں اس کے لئے یہ کتنی کوفت کی بات ہوتی ہے وہ خطوط جن کا تعلق مقررہ تاریخوں کے پروگراموں سے ہو یا کسی نے اپنی آمد کی اطلاع دی ہو یا مجھے کسی جگہ جانا ہو۔ اس صورت میں تو آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ آپ میرے ایسے خطوط روک لیں یا تلف کر دیں تاکہ آنے والا پوری طرح پریشان ہو کر پہنچے یا میری آمد و رفت کے پروگرام تہ و بالا ہو جائیں لیکن وہ معمولی ذاتی خطوط جن کا تعلق پروگراموں سے نہیں ہوتا۔ ان کو اگر آپ جلد آنے دیا کریں تو بڑی نوازش ہو گی۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ میرے نام جو خطوط آتے ہیں اور جن کے لفظ لفظ کو پڑھنا آپ کے لئے تفریحِ طبع کا باعث اور فرائضِ منصبی کا جزو ہے انہیں اوّل تو آپ کھولنا نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو بند کرنا نہیں جانتے اور اگر وہ بھی جانتے ہیں تو پھر اتنی بدتمیزی سے بند کر کے آپ مجھ پر بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اس بات کا تو آپ کو بھی اعتراف ہے کہ در اصل ان خطوط کے اصل حق دار مکتوب نگار اور مکتوب الیہ ہی ہوتے ہیں۔ آپ نہیں ہوتے اسی لئے آپ نے چھپ چھپ کر پڑھنے کی پوزیشن اختیار کر رکھی ہے

لیکن پھر بھی اگر آپ میرے خطوط مجھ سے پہلے پڑھنے کا کہیں سے پروانہ حاصل کر چکے ہیں
تو کم از کم انہیں مناسب طریقے پر بند تو کیا کریں، خود تو آپ اطمینان سے پڑھ لیتے ہیں۔
اور اس کے بعد گوند پانی کا ایک چمچہ بھر کر آپ لفافے کے فلیپ پر لیپ دیتے ہیں جو پھیل
کر اندر کے خط پر بھی چپک جاتا ہے اور جب میں اس خط کو کھولتا ہوں تو ہزار احتیاط کے
باوجود لفافہ خط کا کچھ نہ کچھ حصہ کاٹ ہی لیتا ہے۔ اگر آپ محسوس کرتے ہوں کہ اس خط کے
بعض جملے میری نظر سے نہ گزرنا چاہیں اس لئے کہ ان کا میری نظر سے گزرجانا حکومت
کے بہترین مفاد کے منافی ہو سکتا ہے تو آپ شوق سے انہیں قلمزد کر سکتے ہیں یا خط ہی
پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں نہ مجھے خبر ہوگی نہ رنج ہوگا لیکن یہ طریقہ تو بڑا بھونڈا ہے کہ آپ
خط کو لفافے کے اندر ایسا چپکا دیتے ہیں کہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی تلف ہو جاتا ہے
میری گذارش یہ ہے کہ آپ چوری چھپے لفافے کھولنا، اور پھر احتیاط سے بند کرنا سیکھیں
آپ جانتے ہیں کہ چوری کے لئے بھی ایک سلیقے کی ضرورت ہے اور اگر آپ یہ کام سلیقے
سے انجام دیں اور اس کام میں سلیقے کو کبھی ہاتھ سے نہ دیں تو یہ بھی ایک آرٹ ہے
اور آپ اس آرٹ کے ماہر ہونے کی حیثیت سے فن کار کہلا سکتے ہیں۔

تیسری گذارش یہ ہے کہ یہ جو میرے نام اخبارات ورسائل آتے ہیں۔ یہ سب مطبوعہ
جرائد ہزاروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور عام بک سٹالوں پر بکتے اور ہاکروں کے ذریعے
فروخت ہوتے ہیں، یہ کوئی اہم ڈاکومنٹس نہیں ہوتے کہ جن کے لفظ لفظ کا مطالعہ کرنا یا کرا کر
سننا، اور اس کی چھان بین کرنا کچھ زیادہ ضروری اور آپ کی ذمہ داری میں شامل ہو۔ اس
کام کے لئے ہماری ذمہ دار اور ہر دل عزیز حکومت نے پریس برانچ کے اندر آپ کے بھائی
علیحدہ متعین کر رکھے ہیں۔ ان مطبوعہ جرائد کو اس طرح چبا چبا کر ہضم کرنے سے آپ کا وقت

بھی ضائع ہوتا ہے اور مجھے بھی انتظار کی گھڑیاں گننا پڑتی ہیں۔ آپ کا وقت اس لئے ضائع ہوتا ہے کہ آپ کو ان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے ذہنی کوفت کے، کیونکہ کام کی زیادتی سے ڈیوٹی سخت ہو جاتی ہے اور مجھے خواہ مخواہ ان اخبارات و جرائد کے لئے کئی کئی دن تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

یہ جرائد پہلے ہی ہزاروں چھلنیوں میں چھنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کو مزید چھانے بغیر براہِ راست مجھ تک پہنچ جانے دیا کریں تو بڑی عنایت ہو گی یہ محض ایک گذارش ہے ورنہ جہاں تک اختیارات کا تعلق ہے آپ کو پورا پورا حق ہے کہ آپ میرے نام آنے والی ایک ایک چیز کو پڑھیں، پھاڑیں، جلائیں، راکھ بنا کر اڑائیں اور پھر اپنے ساتھیوں میں اس کا مذاق اڑائیں۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ آپ کی ان سرگرمیوں پر انگلی اٹھائے جو خالص ریاست کے وسیع تر مفاد کی خاطر آپ عمل میں لاتے ہیں۔

چوتھی گزارش یہ ہے کہ آپ اپنی سرکار عالی مدار سے اس بات کی سفارش کریں کہ میرے خطوط کے ملاحظہ کا انتظام ایک ہی جگہ ہو۔ جگہ جگہ نہ ہو۔ جہاں سے چلے وہاں یا جس جگہ تقسیم کیا جائے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ یہ جگہ جگہ کا ملاحظہ بڑا پریشان کن ہے جہاں سے وہ چلتا ہے پھر جہاں سے وہ (REDIRECT) ہوتا ہے اور جہاں وہ تقسیم ہوتا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی شکایت نہیں کہ تاخیر ہو جاتی ہے البتہ سرکار کے بہت سے عالی دماغ کارکنوں کے اعصاب پہ بلا وجہ بوجھ پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مقصد کارکنوں کی معلومات عامہ میں اضافہ ہو۔ بہر حال ایسی مصلحتوں سے میں کیسے واقف ہو سکتا ہوں۔ البتہ ایک چیز ہے جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ وہ یہ ہے کہ میرے خطوط میں سے کیا تلاش کیا جا سکتا ہے اگر مجھے اس سے ذرا بھی آگاہ کر دیا جاتا تو میں یہ بھی اہتمام کر سکتا تھا کہ ایسے خطوط خصوصی طور پر آپ کی معرفت منگاتا یا بھجواتا، میرا دماغ صرف

یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ حکومت کا تختہ الٹنے کا جو پلاٹ میں بنایا کرتا ہوں وہ بھلا آپ کیسے میرے خطوط میں پا سکتے ہیں اور اس سعیٔ بلیغ کے ذریعے آپ کیا حاصل کرنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ اسے میرے خطوط میں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن اگر میرے خطوط کی چھان بین چھوڑ کر آپ اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور اپنی بستیوں کو دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس پلاٹ کے تو باقاعدہ اڈے ہم نے بستی بستی قائم کر رکھے ہیں اور دن بدن کرتے جا رہے ہیں جن میں وہ پلاٹ مرتب کتابوں کی شکل میں رکھا جاتا ہے۔ بستیوں کی بستیاں اس سازش میں شریک ہوتی جا رہی ہیں اور خطرہ یہ ہے کہ یہ سازش اگر یونہی پھیلتی رہی تو عوام میں اس کا پھیل جانا اور آپ کا اس سے بے خبر رہنا حکومت کے بہترین مفاد کے منافی ہوگا۔ لیجئے ان سطور کے ذریعے میں نے اس پلاٹ پر سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اس معاوضے کے بغیر اٹھا دیا ہے جو آپ جگہ جگہ ہمارے دفتروں کے ناظمین کو پیش کرتے ہیں اور جواب میں مایوسی حاصل کرتے ہیں اور جس کی تلاش آپ مدت سے میرے خطوط میں کر رہے ہیں۔ دیکھئے میں کس قدر غیر سیاسی آدمی ہوں کہ اپنے بھید خود بتائے دیتا ہوں اور پھر بھی آپ ہیں کہ مجھ پر "سیاسی" کا لیبل لگا کر پریشان ہوئے جا رہے ہیں۔

آخری گذارش اس مسئلے سے متعلق ہے جس پر آپ نے چند دن پہلے بات چھیڑی تھی۔ اگلے دن جب آپ ملے تو آپ نے فرمایا تھا کہ جو کام ہمارے ذمے ہے اس پر کبھی کبھی ہمارا ضمیر بھی سخت ملامت کرتا ہے لیکن ہم اسے ذریعۂ معاش اور ملازمت سمجھ کر کئے جاتے ہیں اور اس خیال سے مطمئن ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے اور ڈیوٹی ادا کرنا ایک فرض شناس ملازم کے لئے ضروری ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ہاں بے شک آپ تو مجبور ہیں جس طرح کسی مشین کا پرزہ مجبور ہوتا ہے۔ کہ مشین کے ساتھ حرکت کرے، حرکت نہ کرے گا تو نکال کر پھینک دیا جائے گا آپ اگرچہ میرے اس جواب پر مطمئن سے ہو گئے تھے لیکن ممکن ہے اس بات کے دوسرے پہلو پر نظر جانے سے اطمینان زائل ہو گیا ہو۔ اگرچہ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ آپ کا اتنی محنت سے پیدا کردہ اطمینان زائل کر دوں لیکن یہ بات کہنا تو بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی مشین کا پرزہ بن جانا ہی تو آدمی کے بری الذمہ ہونے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیئے کہ آدمی آدمی ہے، دھات کا بے جان پرزہ نہیں ہے اور اس کے پاس ایک چیز وہ بھی ہے جسے آپ نے ضمیر کے نام سے یاد کیا تھا۔ مجھے تو یہ سن کر مسرت ہوئی تھی کہ آپ اب تک اس کا نام نہیں بھولے۔ اگرچہ کھیلتے کھیلتے بعض لوگ تو اس سے بالکل ہی ہاتھ دھو لیا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی سن لیجئے کہ آدمی اگر کسی مشین کا پرزہ ہی بنے تو اسے چاہیئے کہ وہ گلوٹین بلیڈ بننے کے بجائے کسی ٹریکٹر کا پھل بنے جو زمین کی زرخیزی کو کھنگالے نہ کہ انسانی سروں کی فصل کاٹے اور ایک عارف تو یہ تک کہہ گیا ہے۔ کہ جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آئے شاہبازوں کے نزدیک تو اس سے موت اچھی ہے۔ البتہ کوّے اور گدھ تو مرداروں کو بھی چھوڑتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ میں آپ سے خط کے جواب کی توقع نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اگر آپ نے میرے نام اپنے ضمیر کی موجودگی میں خط لکھ دیا تو پھر آپ کو خود ہی اپنی دوسری حیثیت سے اسے ملاحظہ فرمانا پڑے گا۔ اور یہ ایک ایسی پوزیشن ہو گی جس میں اپنے آپ کو ڈال لینا کسی سمجھ دار آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

(تصویریں، ۱۹۵۴)

تین دیندار

(۱)

حاجی صاحب بہت دیندار آدمی ہیں۔ پچھلے دنوں حج بھی کر آئے ہیں، لیکن ان کی اہلیہ بہت ماڈرن ہیں۔ ہر نیا فلم جو قریبی سینما میں آتا ہے ضرور دیکھ آتی ہیں اور ہر نیا ریکارڈ جو بازار میں بجتا سنائی دیتا ہے ضرور چند دن کے بعد حاجی صاحب کے ہاں بھی بجنے لگتا ہے۔

ایک دن ضبط نہ ہو سکا اور مَیں نے کہہ ہی دیا۔

حاجی صاحب نے بہت سنجیدگی سے میری بات سن کر کہا۔

"میاں صاحب یہ گمان نہ کریں کہ میں بھی اس کے ساتھ سینما دیکھنے جاتا ہوں۔ مجھ سے تو یہ تو بہ خدا اور رسول ؐ کی یہ نافرمانی نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو اس سے صاف

کہہ دیا ہے کہ نیک بخت مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ میں بھی تمہارے ساتھ فلم دیکھنے جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔ مَیں خدا کے فضل سے ایسی لہو ولعب سے بالکل بَری ہوں"۔
میں حیرت سے حاجی صاحب کی دین داری پر غور کرتا ہوا رہ گیا۔ اور وہ میری حیرت پر حیران سے ہوکر چلے گئے۔

(۲)

" میرے چند رشتہ دار حرام ذرائع معاش رکھتے ہیں۔ میں ان سے قطع تعلق کر رہا ہوں۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھوں"۔
" کیا وہ حرام ذرائع معاش جان بُوجھ کر اختیار کئے ہوئے ہیں"۔
" نہیں صاحب ان کو تو حلال وحرام کی تمیز ہی نہیں ہے"۔
" کیا آپ نے ان کو حلال وحرام کا فرق اور خدا اور رسولؐ کے احکام بتا کر اپنے طور پر تبلیغ کا حق ادا کرکے اتمامِ حُجّت کر دیا ہے"؟
دین دار کا رنگ فق ہو گیا۔
" اب تک کوئی مناسب موقع نہیں مل سکا"۔
یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیئے۔ (۳)
" چلئے بھائی! خدا کی راہ میں نکلئے۔ خدا کی راہ میں وقت دیجئے"۔
" کہاں نکلیں"؟
" لوگوں کو تبلیغ کرنے چلیں۔ گشت کریں۔ لوگوں کو کلمہ سکھائیں، نماز سکھائیں، ایک جماعت شہر سے باہر کی بستیوں میں صرف دو دن کے لئے جا رہی ہے۔ دیکھئے دفتر سے

دو دن کی چھٹی لے کر خدا کی راہ میں جا رہا ہوں۔"

"آپ کس دفتر میں ہیں؟"

"کواپریٹو بنک میں۔"

"یعنی آپ مہاجن کے سودی کاروبار کے منیم ہیں۔ کیا آپ اس بات سے بے خبر ہیں کہ سُود لینے والے، دینے والے، اس کا حساب کتاب رکھنے والے، اور اس کا معاہدہ لکھنے والے کے خلاف خدا اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ ہے، آپ نے کس قدر خطرے میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے؟"

"آپ کا تعلق شاید اسلامی جماعت سے ہے۔ اچھا السلام علیکم۔"

(تصویریں)

۱۹۵۲ء

اسلامی عجائب گھر

ہماری ملّت نے اپنا ایک قومی عجائب گھر بنا رکھا ہے جو اپنی رفعت، تقدس اور عظمت کے لحاظ سے دنیا میں منفرد ہے۔ میں نے جب کبھی اس کی سیر کی ہے احترام سے میری گردن ہمیشہ جھک گئی ہے۔ ایسی ایسی ہستیوں کے کارناموں سے یہ مقدس عجائب خانہ مزین ہے جن کے کارنامے یاد کرکے یہ ملّت اب بھی سینوں میں حرارت دلوں میں ولولہ اور آنکھوں میں عقیدت کی نمی حاصل کرتی ہے۔

ہماری ہر نسل جو اُٹھتی ہے وہ اس عجائب گھر کے احترام و تقدیس میں کمی کی بجائے اضافہ ہی کردیتی ہے۔ اس میں کسی ایک آدھ شخصیت کا اضافہ کرتی ہے اور یہ مقدس متاعِ بے بہا اگلی نسل کے حوالے کرکے رخصت ہوجاتی ہے جو شخصیت اس میں جگہ حاصل کرتی ہے۔ اس کے کچھ اصول کچھ اقوالِ زرّیں، کچھ پُر عزیمت کارنامے

اور کچھ پیغامات یہ ملت ہر سال دہراتی رہتی ہے اور ان کو یہ خراجِ عقیدت ادا کر کے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔

اس مقدس عجائب گھر میں جو ہماری ملت نے اپنی روایات کی وسیع وادی میں تعمیر کر رکھا ہے۔ بے شمار کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں ان محترم ہستیوں کے آثار۔ اقوال، باقیات الصالحات اور کارناموں کا ریکارڈ محفوظ اور مقفل ہے۔ کوئی ان کو خراب نہیں کر سکتا۔ ناپاک ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ منتشر اور پراگندہ نہیں کر سکتا۔ ملت کا ضمیر نہایت چاق و چوبند محافظ کی طرح اس پر پہرہ دیتا ہے اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ عجائب خانہ کی مقدس فضا کو پراگندہ کر سکے۔ کوئی غیر مسلم تو بہرحال یہ جرأت کر کے بچ نہیں سکتا۔ البتہ کوئی مسلمان اختلاف کی ڈھال لے کر کچھ کر گزرے تو ملت اسے یہ سزا دیتی ہے کہ کچھ عرصے کے اندر ہی اس کی ہستی کا نشان مٹا دیتی ہے۔

وہ محترم لوگ جنہیں اس روایاتی عجائب خانہ میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ ان میں بڑی بڑی ذی شان ہستیاں ہیں۔ یہاں حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت امام مالکؒ اپنے اکھڑے ہوئے بازوؤں کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ خلیفہ منصور عباسی کے کوڑوں سے لہولہان پیٹھ کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ ۲۰ سال تک مسلمان بادشاہوں کے جور و ستم کی داستان کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ موجود ہیں۔ حضرت سید احمد شہیدؒ موجود ہیں۔ سید جمال الدین افغانیؒ۔ علامہ اقبالؒ اور دوسرے کتنے ہی محترم حضرات ہیں جو یہاں موجود ہیں۔ جن کے نام اور کام موجود ہیں۔ عزت و احترام و تقدیس کے جذبات موجود ہیں۔ یہ ملت کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جسے نہایت حفاظت

سے رکھا گیا ہے اور ایک ایک مسلمان اس عجائب گھر کا خاکہ اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے۔

یہ محترم و مقدس ہستیاں اپنے اپنے زمانے میں اسلام کی حفاظت اور اس کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتی رہی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے دور کی جابر اور قاہر قوتوں سے ٹکر لی۔ اور بڑی سے بڑی مصیبت اور ابتلاء اپنے جسم و جان پر برداشت کی۔ ان میں سے بیشتر کو خود مسلمان جابر حاکموں سے ہی واسطہ پڑا اور انہیں کی سختیاں انہوں نے عزیمت کی زبردست قوت سے برداشت کیں۔ جب وہ کام کر رہے تھے اور اپنے اپنے دَور میں حق کی حمایت کے لئے جان لڑا رہے تھے تو ان کی مزاحمت کرنے والے بالعموم بگڑے ہوئے مسلمان ہی تھے۔ ان پر سختیاں ہوتی رہیں۔ ان پر کوڑے برستے رہے۔ ان کو شہید کیا جاتا رہا۔ ان کو بے یار و مددگار سمجھ کر فوجوں کی قوتوں اور پولیس کی سازشوں سے مصائب میں مبتلا کیا جاتا رہا۔ بالآخر وہ اپنا وقت پورا کر کے گذر گئے اور ان کو تنہا ہی ان مصیبتوں میں سے گزرنا پڑتا رہا۔ ملت کے اندر سے ان کی مدد کے لئے پُر عزیمت اور غیرت مند لوگ کم ہی آگے آئے۔ جب وہ گزر گئے تو بعد میں آنے والوں نے ان کے کارناموں کو زرّیں حروف سے لکھا۔ ان کے لئے احترام و تقدیس کی اُونچی شاہ نشینیں تعمیر کیں اور ان کو ملت کے عجائب خانہ میں سجا کر شہرتِ دوام کا پہرہ ان پر بٹھا دیا۔ ان کے نام پر ریسرچ کے ادارے قائم کئے۔ ان کے مشن کی تعریف و توصیف کی۔ ان کے بارے میں کتب تصنیف کیں۔ ان کے لئے یوم مقرر کر کے ان کی یادگار کو سال بہ سال منانے کا اہتمام کیا۔ ان کی یاد میں آنسو بہائے۔ ان کے اصولوں کو حق تسلیم کر کے زرّیں حروف سے لکھ لکھ کر جگہ جگہ مزین کیا۔ اور ان کو اپنی تاریخ کی محترم و مقدس اور شاندار شخصیتوں میں جگہ دے کر قومی ہیرو بنا دیا۔

لیکن جب ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے دور میں انہیں زرّیں اصولوں کو پیش کر رہا

تھا، اور اس کے لئے وقت کے جابر حاکموں کے کوڑے کھا رہا تھا۔ تو ملت کی ان وسیع آبادیوں میں سے کوئی آگے نہ بڑھا جو ان کا ساتھ دیتا۔ حضرت امام حسینؑ نے دیکھا کہ خلافتِ اسلامیہ جو ایک نظریاتی مملکت ہے، جو شورائی جمہوریت ہے جس کی حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہے۔ مسلمانوں کا یہ ملی ادارہ جس پر اس ملت کی اجتماعیت قائم ہے۔ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بادشاہت کے عظیم خطرے کو انہوں نے مستقبل کے پردوں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا جو بدترین نتائج کے ساتھ بڑھا چلا آ رہا تھا جو ان کی لاش کو کربلا کے میدان میں روند کر آگے بڑھا تو پھر صدیاں ہی گذر گئیں اور مسلمان ملت اس سے آج تک نجات نہ پا سکی۔ اسی خطرے کو روکنے کے لئے انہوں نے کربلا میں جا کر مورچہ بنایا تھا۔ اقتدار کی جنگیں سروسامان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ لیکن اصولی جنگیں بالعموم بے سروسامانی کی جنگیں ہوتی ہیں۔ ان کے بچے بھی کربلا میں کٹ گئے۔ لیکن کہیں سے کوئی آواز ان کی حمایت میں نہ اٹھی۔ آج یہ ملت گذشتہ کئی صدیوں سے ان کے لئے سینہ کوبی کر رہی ہے۔ ان کی شان میں بے شمار قصیدے لکھے گئے ہیں۔ ان کی یاد میں آنسو بہانے کو بھی جنت کی کنجی قرار دے رکھا ہے۔ ان کے کارنامے آج بھی بڑے ترنم اور ولولے سے بیان ہوتے ہیں۔ اور سارا غصہ ان کے مقابلے میں لڑنے والوں پر نکال دیا جاتا ہے۔

کیا کربلا کا معرکہ ختم ہونے کے بعد کبھی کوئی شخص جبر و قوت کی ناہری سے ان اصولوں کو پامال کرتا نظر نہیں آیا۔ جن اصولوں کو اس وقت کے حاکم نے پامال کیا تھا۔ کیا پھر کبھی کوئی امام حسینؑ کی طرح ان اصولوں کی حفاظت کے لئے سربکف نظر نہیں آیا۔؟

ملت کے اس عجائب خانے کی سیر کیجئے تو آپ کو بلینیوں ایسے لوگ ملیں گے جنہوں

نے اپنے اپنے وقت میں، مسلکِ امام حسینؑ کی پیروی کی۔ حق کے لئے اٹھے اور ان کے زمانے کے جابروں نے ان کے ساتھ وہی طرزِ عمل روا رکھا۔ جس سے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو واسطہ پیش آیا تھا۔ لیکن ملت کی طرف سے کیا ردِ عمل رہا؟

زبانِ خموشی سے ملت نے ایسے ہر موقعہ پر یہی کہا کہ۔ " اسے مرنے دو۔ پھر دیکھو ہم اسے اپنے اسلامی عجائب خانہ میں کتنی شاندار جگہ دیں گے۔ اس کے کارنامے سنہری حروف سے لکھیں گے۔ اس کا یوم منائیں گے۔ اس پر تحقیقاتی ادارے قائم کریں گے۔ اور اسے رحمۃ اللہ علیہ قرار دے کر عزت و احترام کی اونچی شہ نشین پر بٹھائیں گے۔ اور اس کے خلاف ظالم کو ہمیشہ برسرِ غلط سمجھیں گے۔"

بس یہی طرزِ عمل ہے جو اس ملت نے اپنے اندر حق و باطل کی کشمکش کے دونوں کرداروں کے ساتھ ہمیشہ روا رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی ہیبت ناک غیر جانبداری ہے یہ ایک ایسا اجل گرفتہ سکوت ہے۔ ——————— یہ ایک ایسا سنگین جمود ہے۔ جس نے اس ملت کو دنیا کے چوراہے پر بے حس و حرکت مجسمے کی طرح نصب کر رکھا ہے۔ ایسا مجسمہ جو عزت و ذلت اور عظمت و پستی کے ہر احساس سے خالی ہوتا ہے۔

امام حسینؑ جن اصولوں کے لئے لڑے وہ بعد میں بھی پامال ہوتے رہے۔ لیکن ان کے لئے سینہ کوبی جاری ہے اور حسرت کی جاتی ہے کہ اگر اس زمانے میں ہم ہوتے تو ضرور ہی امامِ شہیدؑ کا ساتھ دیتے۔ حالانکہ وہ اصولی کشمکش تو ہر دور میں اب تک چلی آرہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ظلم کی عدالت میں قاضی بننے سے انکار کر کے پیٹھ لہو لہان کروالی۔ ان کے کارناموں کو محفوظ رکھا گیا ہے لیکن دنیا میں ظلم کی عدالتیں بھی قائم

ہیں اور ان میں مسلمان قاضی بھی اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین پر جلدوں کی جلدیں تصنیف ہو رہی ہیں اور الم انگیز عبارتوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ لیکن ان کا مقصد حکومتِ الٰہیہ پامال ہوتا ہے اور کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ اقبال اکیڈمیاں اور بزمیں موجود ہیں۔ لیکن اس کا زیادہ پیغام ریڈیو پر طوائفوں کے ذریعے ہی نشر ہوتا ہے اور وہ بھی خوب لہک لہک کر بار ہا گاتی ہیں ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اور ہر طرف اس دورِ آخر کے احیاء پر ہی زور دیا جاتا ہے۔

غرض ہماری ملّت کا یہ عجائب گھر عبرت کا ایک عظیم مرقع ہے۔ قول و فعل کے تضاد کا ایک جیتا جاگتا شاہد ہے۔

آج کوئی اسی کام کے لئے اٹھے جس کے لئے اس عجائب خانہ میں سجائی ہوئی محترم ہستیاں اٹھتی رہی ہیں تو اس کے ساتھ بھی وہی طرزِ عمل روا رکھا جائے گا۔ اس پر کیچڑ اچھالا جائے گا۔ اسے بدنام کیا جائے گا۔ اسے غدّار قرار دیا جائے گا۔ اسے جیل اور پھانسی کی کوٹھڑیاں دکھائی جائیں گی۔ اور جب وہ اس دنیا سے اپنا وقت پورا کر کے گزر جائے گا تو اس کی یاد میں ادارے قائم ہو جائیں گے۔ کتابیں تصنیف ہو جائیں گی۔ یوم منایا جائے گا اور اسے اٹھا کر اسی عجائب گھر میں سجا دیا جائے گا اور اس کے تمام زرّیں کارناموں کو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

زندہ افراد کے ساتھ یہ عداوت اور مردوں کے ساتھ یہ محبت آخر کیوں ہے؟ شاید اس لئے کہ زندہ افراد تعاون کے لئے پکارتے ہیں اور ان کا ساتھ دینے

کے لئے ایثار و قربانی کرنی پڑتی ہے۔ نفس پر بوجھ پڑتا ہے۔ مخالف مقتدر طاقتوں کے ساتھ کشمکش کے بہت سے مادی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اور یہ کھکیڑ اٹھانا ملت کے لئے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ "تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں" یہ بنی اسرائیل والا مسلک اس نے بھی اختیار کرلیا ہے۔ البتہ مُردوں کے ساتھ محبت و احترام اس لئے ہے کہ نہ تو وہ تعاون کے لئے پکارتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ مل کر کسی کشمکش میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف الفاظ کے پھول برسا کر حق پسندی کا یہ سستا مظاہرہ سہولت پسندوں نے اپنے مسلک رخصت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ ملت کا یہ عجائب گھر حقیقت میں عبرت و موعظمت، کا ایک عظیم دفتر اپنے اندر رکھتا ہے۔

(انتظار)

۱۹۵۹ء

بڈھے مجاہد کی وصیت

میرے بیٹے ۔میرے لخت جگر۔

ان شیشوں اور بوتلوں کو ہٹاؤ جو میرے مہمانِ عزیز کی راہ میں روڑوں کی حیثیت سے پڑی ہیں۔ اور اس کے لئے راستہ صاف کردو ۔جس کا میں نے زندگی بھر انتظار کیا اور اس کی آمد سے میں کبھی بھی بے خبر نہیں ہوا۔ اسے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں اس کے پروں کی سرسراہٹ اور اس کے قدموں کی چاپ ہوا کی لہروں پر سن رہا ہوں اس سے پہلے کہ وہ آئے اور میں اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں ۔ میں تم سے آج صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں ۔یہ بات میرے مقصدِ زندگی سے متعلق ہے ۔ وہ مقصدِ زندگی جسے میں نے اپنے پورے دل ودماغ پورے اعضا وجوارح اور پوری روح کی گہرائیوں کے ساتھ چاہا جسے میں نے عمر بھر ہر شے سے زیادہ عزیز رکھا۔

ہاں میرے لختِ جگر۔ میرے بیٹے۔ تم سے بھی زیادہ عزیز!

آؤ میرے قریب بیٹھو۔ اور قریب۔ نہ مجھ سے جھجکو۔ نہ گھبراؤ۔ اور نہ تکلف کرو یہ تکلف کا موقعہ نہیں۔ بلاوا آئے گا تو میں ٹھہر نہ سکوں گا۔ اس وقت مجھے تم سے صاف صاف بات چیت کرنی ہے۔ معاملے کی بات چیت۔ بالکل کاروباری بات چیت دو اور دو چار کی طرح۔ جھجک، تکلف اور بیجا ادب آداب کو ایک طرف رکھو اور مجھ سے آنکھیں چار کر کے بات کرو۔ تم اس سے بے خبر نہیں ہو کہ میں عمر بھر بے کار نہیں رہا۔ عمر بھر کاروبار کرتا رہا ہوں۔ وہ کاروبار جس میں میں نے اپنی ساری زندگی سرمایہ بنا کر لگائی ہے جس کے لئے میں نے اپنی راتوں کی نیند اور دنوں کا آرام حرام کیا ہے۔ جو کاروبار مجھے دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز رہا ہے۔ ہاں وہی کاروبار اب میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔

سُن لو کہ یہ میری زندگی کی کل کائنات ہے۔ یہ میرا سارا اثاثۂ حیات ہے یہی سب کچھ ہے۔ جو میں تمہارے لئے وراثت چھوڑ جانا چاہتا ہوں۔ اگر تم کو یہ وراثت قبول ہو تو مردوں کی طرح میرے سامنے اسے قبول کرنے کی حامی بھرو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس امانت کا بوجھ اٹھاؤ۔ اور اگر اس سے گھبراؤ۔ یا اسے میرے بعد برباد کر دینے کا ارادہ ہو۔ تو ابھی سے بتا دو تاکہ میں اپنے مالک کے پاس پیش کرنے کے لئے کوئی عذر سوچ رکھوں وہی عذر جو حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کے بارے میں اپنے رب کے پاس پیش کریں گے۔

میرے بیٹے۔ میرے لختِ جگر۔ تم یوں حیرت و استعجاب سے میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو۔ شاید اس تصور سے کہ میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ حالانکہ یہ عارضی جدائی ہمیشہ

کی رفاقت کے لئے ناگزیر ہے یا شاید تم کو یہ صدمہ ہے کہ میں تم سے بھی زیادہ عزیز کسی چیز کو قرار دے رہا ہوں ۔ تم سے بھی زیادہ گہرے دل سے کسی چیز سے عمر بھر پیار کرتا رہا ہوں ۔ تم سے بھی زیادہ کسی کو چاہتا رہا ہوں ۔ ہاں سُن لو ۔ کہ وہ محبوب شے میرا مقصدِ زندگی ہے جسے میں نے تہ دِل سے ہمیشہ ہر دنیوی شے سے زیادہ چاہا ہے جس کے لئے میں نے عمر بھر دوسروں کے بچوں کو زرق برق لباسوں میں دیکھنے کے باوجود تمہیں موٹا جھوٹا پہنایا ۔ دوسروں کو اپنے بچوں کے لئے مرغن غذائیں فراہم کرتے دیکھنے کے باوجود تمہیں روکھی سوکھی دیتا رہا ۔ دوسروں کو عیش و عشرت کے سامانوں کے درمیان چھوڑ کر تمہیں ہمیشہ سادہ زندگی کا سامان فراہم کیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تم سے زیادہ اسی مقصدِ زندگی کو چاہا جسے میں نے اپنایا تھا ۔ اس لئے کہ اس سے میری آخرت بنتی تھی ۔ اور مجھے یہ پسند نہ تھا کہ تمہاری دنیا بنانے کے لئے میں اپنی آخرت کو تباہ کر دوں ۔

تم گھبراؤ نہیں ۔ تم اپنے باپ کی عادت سے خوب واقف ہو ۔ میں نے عمر بھر لاگ لپیٹ کی بات کبھی نہیں کی ۔ نہ تم کو سکھایا کہ زندگی میں لاگ لپیٹ سے کام لو ۔ تم اپنی ماں کو دیکھو ۔ کہ جو کبھی دنیوی لحاظ سے ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی ۔ اس نے کس طرح میرے ساتھ پیمانِ وفا نبھایا ۔ اب تو اس کا سر کپاس کی مانند سفید ہے ۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی بھی دنیا کے فیشن اور رکھ رکھاؤ کے پیچھے پریشان ہوتے نہیں دیکھا ۔ اس نے مجھے جیسے دیکھا ۔ اسے جانچ کر جب کھرا پایا تو پھر اپنے آپ کو ویسے ہی ڈھال لیا ۔ یہی توقع میں تم سے رکھتا ہوں ۔ بلکہ یہ توقع رکھ کر ہی میں تمہیں پالتا رہا ہوں ۔ میں نے تم سے صاف صاف کہہ دیا تھا ۔ کہ دین کی اخلاقی

قدروں کے بارے میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ اس میں بے احتیاطی کروگے تو میری آنکھوں کا کانٹا بن جاؤگے۔ اس سلسلے میں مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ اور ویسے تم میری آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک ہو۔

تم مجھ سے اس مالک کی قسم لے لو۔ جس کے پاس میں جارہا ہوں اور جس کے آگے کھڑا ہونے کا خوف مجھے چوٹی سے ایڑی تک لرزاتا ہے کہ میں نے تمہاری رگوں میں حرام لقمے سے بنا ہوا ایک قطرۂ خون بھی دوڑنے نہیں دیا۔ میں نے حرام کی بہتی نہروں میں سے ایک قطرہ بھی لے کر تمہارے حلق میں کبھی نہیں ٹپکایا۔ میں نے تمہارے جسم پر وہ گوشت نہیں پرورش پانے دیا جو دوزخ کی آگ کا ایندھن بننے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں حرام کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ایک پُرنور ستارے کی طرح بچا بچا کر رکھا اور تمہارے دل و دماغ کی نورانی شمع کو کفر و ضلالت کی آندھیوں میں اپنے جھلنی جھلنی دامنِ بندگی میں چھپا چھپا کر بچایا۔ میں نے زندگی بھر دنیا کے معاملات میں اپنے سے نیچے کی طرف اور دین کے معاملات میں اپنے سے اوپر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اور اس طرزِ عمل سے جو کچھ بھی سمیٹا۔ وہ اپنے مالک کی راہ پر آگے ہی آگے بڑھنے کے لئے صرف کیا۔

تم میری روداد زندگی سے واقف ہو۔ تم خود میری زندہ روداد زندگی ہو۔ یہ تمہاری بوڑھی ماں جس کے بال آج میری رفاقت میں سفید ہو رہے ہیں۔ میری اس ساری سرگذشت پر گواہ ہے اور جس کی گواہی مجھے اپنے مالک کے حضور بھی کام دے گی۔

میرے بیٹے، پریشان نہ ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ توجہ سے سنو۔ تم کسی عیش پسند نواب اور رئیس کے بیٹے نہیں ہو۔ کہ عیش و عشرت کے خواب دیکھو اور خوابوں میں ہوائی قلعے تعمیر کرو اور اونچی اونچی دنیوی آسائشوں کی تمناؤں سے اپنا پیٹ پھلاؤ۔ تم ایک سپاہی کے

بیٹھے ہو جس کا بستر ہمیشہ اس کی کمر پر رہا۔ جس کا سامانِ زندگی اتنا ہی تھا جتنا ایک مسافر کا زادِ سفر ہوتا ہے۔ اس دنیا میں سے جو کچھ میرے حصے میں آیا ہے وہ صرف اور محض تم ہو تم ہی میرا سرمایہ ہو۔ اس سرمایہ کو بھی میں اسی کاروبار میں لگانا چاہتا ہوں جو کاروبار میں عمر بھر کرتا رہا ہوں۔ یہ کاروبار اللہ کے دین کو تمام دوسرے دینوں پر غالب اور سربلند کرنے کی جدوجہد ہے۔

میرے کاروبار میں جو کچھ مجھے نفع ہوتا رہا ہے وہ میں ایک ایسے بنک میں جمع کراتا رہا ہوں جو اس زندگی میں ملنا مشکل ہے۔ وہ دوسری زندگی میں ہی نکلوایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقد نفع سامنے نہ ہونے کے سبب زیادہ لوگ اس بنک میں سرمایہ جمع نہیں کراتے اور ان بنکوں میں جمع کراتے ہیں۔ جہاں سے وہ جب چاہیں نکلوالیں۔ میں نے اپنے مالک کے وعدوں پر اعتماد کر کے اسی کے بنک میں اپنا سارا سرمایہ جمع کرایا اور چونکہ مجھے اس پر اعتماد تھا اس لئے مجھے کبھی بھی کوئی خدشہ اس کے بارے میں محسوس نہیں ہوا۔ میرا مالک چونکہ میرے خورد و نوش کا ضامن تھا اس لئے میں اپنے آپ کو اس کا ہمہ تن اور ہمہ وقت سپاہی سمجھتا رہا ہوں اور میں نے کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات کو اس کی خوشنودی پر ترجیح نہیں دی۔ البتہ بندے کی کمزوریوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میرے مالک کے دامنِ عفو و رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے ؎

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

اسی کے بھروسے اور توکل پر میں نے جہادِ زندگانی کے ہر مرحلے میں قدم اٹھایا اور عمر بھر اس کے دشمنوں سے نبرد آزما رہا۔

میرے بیٹے سنو۔ مزید توجہ سے سنو۔ میں عمر بھر اپنے مالک کے دشمنوں کے خلاف، نبرد آزما رہا ہوں۔ عمر بھر میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ اور اس جانگسل کشمکش کو جاری رکھا۔ میں نے اپنے آقا کے باغیوں سے پیہم جنگ کی۔ اپنی ساری زندگی اس میں کھپائی۔ میں نے اپنی حد تک اس میں کوتاہی نہیں کی۔ جنگ کی کیفیت میرے ہر حال سے ظاہر ہوتی رہی۔ تم پر اس کے اثرات پڑے۔ میری زندگی کا ہر گوشہ یہ بتلا تا رہا کہ یہ شخص حالتِ جنگ میں ہے۔ میں نے کبھی تکان کا عذر نہیں کیا اور نہ مشکلات پر معذرت کی۔ میں نے کبھی اپنے آقا کے باغیوں سے صلح نہیں کی اور نہ مصالحت کی۔ میں نے کبھی اپنے مالک کے غداروں کو معاف نہیں کیا اور نہ ان کے مقابلے میں اپنے اندر کوئی کمزوری پیدا ہونے دی۔ لیکن ان ظالموں نے تیرے باپ کو اپنے ظلم وستم، اپنے وزائع وسائل کی کثرت اور اپنی قلبی شقاوت سے بے بس کر دیا۔ اور وہ مجبور ہو گیا۔ وہ اس کشمکش کو اس آخری معرکے تک نہ پہنچا سکا۔ جس میں ظالموں پر آخری کاری ضرب لگائی جا سکتی اور ان کا عجب وغرور اس طرح سرنگوں ہو جاتا۔ جیسے بگولہ بارش کے چند چھینٹوں سے ہی خاک نشین ہو جاتا ہے۔ میں عمر بھر اس آخری معرکے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن اس سے پہلے ہی میرے مالک کا بلاوا آ گیا۔ اب میں تو اس میدانِ کشمکش سے رخصت ہو رہا ہوں، اور تمہیں اپنی جگہ کھڑا کرنا چاہتا ہوں۔

ہاں میرے بیٹے، میرے لختِ جگر۔ میری وصیت لکھو۔ مالکِ کائنات کو گواہ ٹھہرا کر صدقِ دل سے لکھو۔ قرآن پر ہاتھ رکھ کر لکھو۔ لکھو کہ۔

میں عبداللہ ابنِ مسلم اپنے اور اپنے باپ کے دشمنوں، تمام اہلِ ایمان کے معاندوں اور احکم الحاکمین کے باغیوں سے عمر بھر جنگ آزما رہوں گا۔ کبھی ہتھیار نہیں رکھوں گا۔ کبھی

شکست تسلیم نہیں کروں گا۔ انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میری یہ جنگ خالص اللہ رب العلمین کے لئے ہو گی جو میرا اور سارے جہاں کا اصل مالک و خالق و حاکم ہے۔ میں یہ جنگ جاری رکھوں گا۔ تا آنکہ اس جنگ کا نتیجہ اہلِ ایمان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر نمودار ہو۔ یہ جنگ جاری رہے گی۔ نہ اس میں سستی ہو گی نہ مصالحت ہو گی۔ نہ کمزوری آئے گی اور نہ دلِ شکستگی راہ پائے گی۔ میں اس جنگ کو زندگی بھر جاری رکھوں گا۔ تا آنکہ مالک الملک کا بول بالا ہو۔ اس احکم الحاکمین کا حکم چار سو جاری ہو اور اس کے باغیوں کا وقار اور کبر خاک میں مِل جائے اور اگر اس جنگ نے طول پکڑا۔ اور میرا پیمانۂ زندگی لبریز ہو گیا تو یہ علم اپنے پیچھے آنے والوں کے ہاتھ میں دے کر مالک کے حضور میں جاؤں گا۔ تاکہ یہ جنگ نسل در نسل اور زمانہ در زمانہ چلے اور اس وقت تک جاری رہے جب تک باطل سرنگوں نہیں ہو جاتا۔ اور حق غالب نہیں آ جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ حق ہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ غالب ہو۔ لکھو اور اب اس کے نیچے دستخط کرو۔ "عبداللہ بن مسلم" مجھے دکھاؤ۔ بس ٹھیک ہے۔ اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے۔ کہ میں نے اپنی جگہ پہ اپنے آقا کا غلام ایک دوسرا سپاہی کھڑا کر دیا ہے۔ اس مالک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں ابو جہل اور عتبہ کو معاف کر سکتا ہوں۔ جن کے ہاتھوں رسولِ خدا کو بڑی ہی تکلیفیں سہنی پڑی تھیں لیکن۔ لیکن میں زمانے کے کسی عبداللہ بن ابی کو معاف نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔"

ہاں میرے بیٹے۔ میرے لختِ جگر۔ آؤ اور مجھ سے مردانہ وار ہاتھ ملاؤ۔ اللہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں تمہارا حامی و ناصر ہو۔

(انتظار)

۱۹۶۱ء

استقامت کے مینار

درد و غم سے بھر کر آج دل کا پیالہ چھلک گیا ہے۔
مظلوم حق کی صف میں کھڑے ہو کر
اللہ کی راہ میں اپنے خون سے حق کی گواہی دینے والو!
تم پر ہمیشہ سلامتی اور رحمت نازل ہو۔ سورج کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ وہ تمہاری قبروں پر اپنی کرنوں کے پھول نچھاور کرے، اور چاند کے لئے یہ سرمایۂ عزت ہے کہ وہ تمہارے مدفنوں پر چاندنی کی چادریں چڑھائے۔
میں تمہیں اس یقین کے ساتھ مخاطب کر رہا ہوں کہ تم اپنے مالک کے نزدیک زندہ ہو لیکن تمہاری زندگی کی حقیقت سے ہم مادی دنیا کی حدود میں پھنسے ہوئے لوگ باخبر نہیں ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ میرا اسلام اور میرے دل کی بے تابی تم تک پہنچانے کا اہتمام کارکنان

قضا و قدر ضرور ہی کر دیں گے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ اس دنیا کا
سب سے قیمتی تحفہ اللہ کی راہ میں بہایا ہوا خون اور اپنے زخمی حلقوم پیش کریں گے تو مدتوں
کے بعد پہنچنے والا یہ تحفہ حضورؐ کی مسرت کا باعث ہوگا۔ کوثر و تسنیم کے چشموں میں آپ کو غسل
دیا جائے گا۔ جو ہر عمل سے بڑا عمل اور ہر وزن سے بڑا وزن ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تو وہی
راہ ہے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کی راہ
میں جان دوں، پھر زندہ ہوں۔ پھر جان دوں۔ حضورؐ کی اس تمنا سے تم نے اپنا پورا پورا حصہ
پا لیا۔ اور اپنی اس کامیابی پر دنیا کو گواہ بھی بنا لیا۔

کتنے ہی مراحل ہیں جو اللہ کی راہ میں آتے ہیں اور ہر مرحلے کی آمد پر کچھ لوگ آگے
بڑھتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے سامنے اس مرحلے سے گزرنے کی مثال پیش کر دیتے
ہیں۔ گویا مکتبِ عمل کا ایک درس اپنے قافلے کے ساتھیوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ جو
کمزور ہوتے ہیں وہ اس درس سے قوت پکڑتے ہیں، راہ ہموار محسوس کرتے ہیں اور آگے
بڑھتے ہیں۔ یہ کام ہر تحریک میں ہوتا رہتا ہے اور قافلۂ فکر و عمل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن
تم نے تو آگے بڑھ کر اس راہ کا آخری درس دے ڈالا۔ تم نے تو کتابِ عشق کو تمت تک پہنچا
دیا۔ تم نے تو سارا نصاب ہی طے کر لیا۔ قافلے کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ مسافر آگے بڑھتے رہے۔
منزلِ عشق طے ہوتی رہی، راہیں ہموار ہوتی رہیں۔ ساتھی قطار اندر قطار حدی پڑھتے ہوئے
چلتے رہے اور منزل کے نشانوں کی تلاش میں نظریں افق پر بھٹکتی رہیں۔ لیکن تم نے
تو سارے قافلے کو مات کر دیا اور آگے بڑھ کر خود منزل کو گرفت میں لے لیا۔ تم تو سارے
ہی کارواں کو پیچھے چھوڑ کر بہت دور آگے نکل گئے۔ اتنی دور کہ تمہارے قدموں کی گرد بھی

مجھے کہیں سے مل جائے تو اسے اپنے چہرے پر ملنا اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا میرے لئے باعثِ صد افتخار ہو گا۔

فرعونوں کی سرزمین میں یوسفؑ نے ایک اسوۂ زندانی پیش کیا تھا تم نے اس اسوہ کو زندہ کر دیا موسیٰؑ کی قوم نے بچوں کی قربانی سے ایک مثال قائم کی تھی۔ تم نے اس مثال میں پھر رُوح پھونک دی۔ کچھ زرّیں حقائق تھے جو تاریخ کی گرد کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ تم نے اس تاریخ کو پھر دہرا دیا۔ کچھ سامریوں نے اپنے اقتدار کا بچھڑا پوجنے کی کوشش کی، تم نے اپنے عمل کی ٹھوکر سے اسے پاش پاش کر دیا۔ تاریخ کی کوکھ راہِ حق کی قربانیوں سے خالی ہوئی جا رہی تھی۔ تم نے اسے پھر مالا مال کر دیا۔ انسانیت بڑھ بڑھ کر اغراضِ نفسانی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہی تھی اور حق بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ تم نے قربانیوں کا قبلہ پھر اللہ کی طرف پھیر دیا۔ مدت سے لوگ مٹی اور پتھر کے مؤذنوں پر حق کی اذانیں دینے کے عادی ہوئے جا رہے تھے۔ تم نے بتا دیا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر پھانسی کے پھندے کے ساتھ معلق ہو کر سب سے اونچے موذنے پر اذانِ دعوتِ حق دینے والے ابھی دنیا سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ تم نے تو دنیا کے حق پرستوں کو وہ سبق دیا ہے جو انہوں نے دیا تھا جو اللہ کی راہ میں پکڑے گئے۔ پھر زمین کھودی گئی۔ پھر وہ کمر تک اس میں گاڑ دیئے گئے۔ پھر انہیں آروں سے چیر دیا گیا اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں پر سے نوچ ڈالا گیا۔ کتنی تمثیلیں تھیں جن کے زندہ کردار تم بن گئے۔ کتنے منجمد جذبے تھے جن میں اضطراب بن کر تم دوڑ گئے۔ کتنی شکستہ رگیں تھیں جن کی جان تم بن گئے۔ کتنے بھٹکے ہوئے تھے جن کے لئے مشعلِ راہ تم بن گئے۔ تم نے تو فراعنہ کی سرزمین پر انبیاء کے ساتھیوں

کی یاد تازہ کردی۔

حضورِ حق سرخرو ہو کر پہنچنے والو! میں نے نہ تمہیں دیکھا نہ ملاقات کی۔ نہ روابطِ باہمی پیدا کیے اور شناسائی کے پیمانے سے اگر ناپا جائے تو تم میرے لیے ان لاکھوں اجنبیوں میں سے تھے جو روزانہ دنیا سے اپنے مالک کی طرف اپنا حساب دینے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں اور جن کی مجھے خبر بھی نہیں ہوتی لیکن میرے گلے نے بھی وہ گھٹن محسوس کی جس سے تمہیں ہزاروں میل دُور مصر کی سرزمین میں دوچار ہونا پڑا اور میری آنکھوں نے بھی باوضو ہو کر تمہاری یاد کو منایا۔ ہم روزانہ دنیا کے اس کمرۂ امتحان میں سے اُٹھ اُٹھ کر جانے والوں کو ان کا پرچۂ امتحان چھینتے دیکھتے ہیں۔ اور ہم ہی ان سے اپنے پرچے کے حساب کم و بیش کا احساس کرتے ہیں لیکن یہ تم نے کس انداز سے اپنا پرچۂ امتحان دیا کہ ساری محفل کو اپنے پاس ہونے کا یقین دلا گئے۔ میں نے سنا کہ جب تمہیں راہِ حق کے اس اُونچے موڑ پر لایا گیا جسے لوگ پھانسی کہتے ہیں تو تمہارے چہروں پر تشکّر و امتنان کی جھلک تھی۔ تم گویا وہ کچھ دیکھ رہے تھے جسے عین الیقین کہا جاتا ہے۔ تم نے اپنے آخری راہوار پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"اللہ انہیں معاف کر دے جنہوں نے مجھ پر ظلم کیا۔"

"اللہ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے شہید کا مرتبہ عطا فرمایا۔"

"میرے خون کے ہر قطرے سے انقلاب پیدا ہوں گے۔"

تم نے ظالم کے سامنے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آیا ہوں تمہیں اس کی ضرورت ہے تو یہ حاضر ہے۔"

جب کسی خاندان کا کوئی فرد اونچا سرکاری عہدہ پاتا ہے تو اس کا سارا خاندان فخر کرتا ہے، خوشیاں مناتا ہے اور مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ کم ظرفوں کو تو معمولی سی حیثیت پا لینے پر بھی آپے سے باہر ہوتے دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ عہدے چند سالوں کے لئے عارضی ہوتے ہیں۔ ایسی حکومتوں کی طرف سے ہوتے ہیں جن کی بے چارگی زمانے کی چند گردشوں سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور جو معتوب ہونے پر چھن جاتے ہیں۔ لیکن تم نے تو خدائی سلطنت میں مقامِ بندگی کا تیسرا سب سے بڑا عہدہ پایا ہے۔ تمہارے اعزاز کا کیا عالم ہے۔ تم تو ان میں سے ہو جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے، کہ "ان پر روؤ یا نہ روؤ لیکن جب تک ان کا لاشہ میدانِ جنگ میں پڑا رہا، ان پر فرشتے اپنے پروں سے سایہ کئے رہے"

تم ٹھنڈے ٹھنڈے قدموں چل کر جنت تک پہنچنے کے تمنائیوں کو مہمیز لگا گئے ہو۔ تم نے زیرِ لب حقائق کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ تم نے استقامت کا لفظ بولنے والوں کو استقامت کا مفہوم سمجھا دیا ہے، تم نے راہِ حق کی سب سے بڑی راز کی بات برسرِ عام کہہ دی ہے اور معرفتِ حق کے اس نکتے پر انگلی رکھ دی ہے جس کو بھول کر لوگ علم و عمل کی رنگا رنگ بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے ہیں اور وادیٔ عشق کو چھوڑ کر آوارگیٔ فکر و نظر کی وادیوں میں سرگرداں اور پریشان رہے ہیں۔ تم نے میثاقِ ازل کو خون کی روشنائی سے لکھ کر تازہ کیا اور اسے پورا کیا اور پیچھے آنے والوں کو اسے پورا کرنے کے انداز بتا گئے۔ کچھ بے رُوح الفاظ تھے جو ہماری دعاؤں میں بار بار آتے تھے۔ کچھ سرد جذبے تھے جو زندگی کی حرارت سے نا آشنا تھے، کچھ خاموش ولولے تھے جنہوں نے ابھی حقائق کا منہ نہ دیکھا تھا۔ کچھ سر بکف ارادے تھے جنہوں نے ابھی شدائد سے ٹکر کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ تم نے ان الفاظ کو مفہوم دیا ان جذبوں کو حرارت دی۔ ان ولولوں کو گویا کیا اور ان ارادوں کو عزیمت سے آشنا کیا۔ کتنے

راہی تھے جو اس راہ پر صرف عقل سے مطمئن ہو کر اس پر بڑھے چلے جا رہے تھے تم نے اچانک انہیں روکا۔ روک کر انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے قلبؓ کی گہرائیوں کو ٹٹولیں۔ اور اپنی رگوں میں گرم گرم خون کی گردش کا اندازہ کر کے آگے بڑھیں۔

یہ خبر سن کر کہ تم راہِ حق کے سبب سے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے ہو تمہارے کتنے دُور افتادہ ساتھی ہیں جنہوں نے پھندوں کے لئے اپنے حلقوم کا جائزہ لے کر دیکھا ہے اور اس ترازو میں تول ڈالنے کے لئے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو جانچا ہے۔ تم محسوس کرا گئے ہو کہ یہ جائزہ لئے بغیر جو راہی اس راہ پر چل پڑتا ہے وہ ایسا بے زادِ راہ مسافر ہے جو سفر کی سختیوں سے بے خبر اور اس کے نشیب و فراز سے ناآشنا ہر وقت حوادثِ راہ کا ممکن شکار ہے۔

اے محفلِ حق کے صدر نشینو! تم تک ایک دور اُفتادہ حقیر ساتھی کا سلام پہنچے۔

(تصویریں)

۱۹۶۵ء

جیل، چڑیاں اور زلزلہ

قید خانے کی کوٹھڑی کے اندر بند ہو جانے کے بعد بھاری آہنی سلاخوں والا پھاٹک گویا سینے پر چڑھا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ہم اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ کر مغرب کی اذان تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی متفرق باتیں۔ اور مغرب کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور پھر ہم نصف پارہ قرآن پاک باترجمہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان شریف میں پورے قرآنِ شریف کا ترجمہ مکمل پڑھ ڈالا جائے۔ تاکہ بیک نظر سارے قرآنی مضامین سامنے آجائیں اور قلب و ذہن ان کی لطافت کے ساتھ ساتھ نصیحت اور ہدایت سے بھی مستفید ہو سکیں۔

ترجمے کے بعد نمازِ عشاء اور تراویح ہوتی ہے۔ ہم نے تو بیس تراویح ہی کا سلسلہ رکھا ہے۔ اگرچہ ہم میں کوئی بھی حافظِ قرآن نہیں۔ تراویح کے بعد شدتِ سرما کے

باعث تھوڑی دیر بیٹھ کر آگ تاپتے ہیں لحاف، کوٹ اور کمبل تک انگیٹھی کے ذریعے گرم کرنے پڑتے ہیں جس سے سردی کی شدت سے واقعی تھوڑی سی نجات مل جاتی ہے۔ یہ طریقہ شروع کرنے سے پہلے بستر میں لیٹنے کے بعد کافی دیر تک نیند نہ آتی تھی اس لئے کہ جسم کی ساری حرارت عزیزی بھی بستر گرم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے برف کے غار میں گھس گئے ہوں۔

آگ تاپنے اور بستر گرم کرنے کے بعد پھر شعر و شاعری کا پیریڈ شروع ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی شاعر نہیں اس لئے علامہ اقبالؒ کی مثنویاں اور حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام جو جیل کی لائبریری سے مل گئے ہیں اور شاید ہم نے جیل میں انہیں پہلی بار جاری کروایا ہے، بہت کام دیتے ہیں۔

ہمارا یہ احاطہ جو سیشن احاطہ کہلاتا ہے اور جس میں ہم سے پہلے سیشن سپرد قیدی رکھے جاتے تھے، چڑیوں کا گھر ہے۔ احاطے کے وسط میں ہمارا کمرہ ہے جس میں دن رات غولوں کے غول آتے ہیں اور چہچہاتے ہیں۔ کمرے کی کوئی شے ایسی نہیں جس پر وہ اپنی مہرِ توثیق ثبت نہ کرتے ہوں، کپڑے، بستر، کتابیں، برتن، کاغذ، جوتے۔ غرض ہمارے پاس ہے ہی کیا جو ان سے محفوظ ہو۔ ہر چیز پر اپنی بیٹوں کے داغ لگا لگا کر ایسا داغدار کیا ہے کہ پنبہ کجا کجا نہم والا مضمون ہو گیا ہے۔ یہ چھوٹا سا پرندہ جو انسانی بستیوں میں آبادی کے سبب خود انسانی بستی کا نشان بن گیا ہے، رونق سے بھرپور ہے۔ جدھر جاتا ہے رونق اُڑ کر اس کے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہے۔ ایک مختصر سی چڑ چوں چڑ چوں اور جب کوئی جھنڈ کا جھنڈ نغمہ چڑ چوں فضا میں آوازوں کی بوچھاڑ کی طرح بکھیر رہا ہو تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے پرندے بکھری بکھری پرزے پرزے آوازوں کے ننھے ننھے گیند ہیں جو یہاں سے

وہاں پھدک پھدک کر رونق پھیلاتے بلکہ تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل بے تکلفی سے آ کر یہ چڑیاں ہمارے تکیوں پر، لیمپ سٹینڈوں پر حد یہ ہے کہ بعض اوقات سروں پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور وہ بالکل نہیں ڈرتیں۔ شاید انہیں احساس ہو گیا ہے کہ وہ اڑ کر باہر جا سکتی ہیں اور ہم نہیں جا سکتے وہ آزاد ہیں اور ہم نظر بند ہیں۔ شاید انہیں یہ بھی فخر ہو کہ انہیں ان کی قوم کے افراد کبھی نظر بند نہیں کرتے اور انسان کو اس کی جنس کے افراد، حسد، عناد، دھاندلی، ظلم و زیادتی اور صرف تسکین نفس کی خاطر نہ صرف قید و بند میں ڈالتے اور طوق و سلاسل میں محبوس کرتے بلکہ بسا اوقات اس کی جان بھی لے لیتے ہیں۔ بہر حال یہاں چڑیاں ہماری سب سے زیادہ پُر رونق ساتھی ہیں۔ ہم ان کی بیٹوں سے بیزار ہیں لیکن ان کی موجودگی چڑیا چوں کا نغمہ رونق اور پھڑپھڑاہٹ سے خوش ہیں اور ان کی خوشی میں ہماری خوشی بھی شامل ہے۔

رات زلزلہ آیا۔ ۷ بج کر دس منٹ پر جب کہ ہم قرآن پاک کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اچانک محسوس ہوا کہ جیسے ہم زمین پر نہیں بلکہ کشتی پر سوار ہیں اور کشتی پانی کی لہروں پر آہستہ آہستہ ڈول رہی ہیں۔ جن لوگوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے جو اپنی قوت و شوکت کا پھریرا اڑاتے اور خدا کے مقابلے میں اپنی حاکمیت کا جھنڈا لہراتے ہیں جو خدا کے قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنے قوانین کو اہمیت دیتے ہیں اگر ان کے پاس چشم بصیرت ہو تو اس ہیبت ناک قوت کا مظاہرہ دیکھیں اگر ان کے بس میں ہو تو زمین کا ایک انچ ہی اس کے اندرونی محور تک ہلا کر ذرا دکھائیں لیکن یہاں بالاتر قوی العزیز کا ہاتھ پوری زمین کو اس طرح ہلاتا ہے جیسے ماں اپنے بچے کے پنگھوڑے کو ہلاتی ہے۔

حسبی اللہ و نعم الوکیل ۰ نعم المولیٰ و نعم النصیر

زمین کانپتی رہی اور ہم اللہ کی پناہ مانگتے رہے۔ ہمارے رفیق شب گرد اور چڑیاں گھبرا

کر اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر ہوا میں اڑا نے لگیں۔ وہ آشیانے جو انھوں نے اپنی حفاظت اور پناہ کے لئے بنا رکھے ہیں۔ انھوں نے بھی محسوس کرلیا کہ اب مالک کی گرفت کے آگے کوئی پناہ ہے۔ پناہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے سروں پر اڑانے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مالک کے سوا اس وقت اور کہاں پناہ تھی۔ ہم فرش پر بیٹھے تھے زمین ڈول رہی تھی۔ چھت سے مٹی گر رہی تھی۔ چڑیاں فضا میں اڑ رہی تھیں۔ باہر بہت دور کتے زور زور سے گھبراہٹ کے عالم میں بھونک رہے تھے۔ پھانسی گھر کے صحن میں لگے ہوئے درخت پر سینکڑوں کوّوں کا بسیرا خوف و ہراس سے پریشان ہو کر کائیں کائیں کا شور مچا رہا تھا اور زمین ڈول رہی تھی۔ ہمارے کمرے کے آہنی پھاٹک پر کئی سیر وزنی تالا لگا ہوا تھا۔ ہم مطمئن تھے بلکہ یکسو تھے اس لئے کہ اپنے مالک کے دامن کے سوا ہمارے پاس کوئی فرار کا راستہ نہ تھا بس وہی ہر مظلوم کی پناہ ہے۔ وہی ہر فریادی کا فریاد رس ہے۔ وہی ہر دکھی کا سہارا ہے۔ وہی ہر مضطرب کا سکون حقیقی ہے۔

حسبی اللہ ونعم الوکیل ۰ نعم المولیٰ ونعم الوکیل

کئی دن سے سنا ہوا ہے کہ ہمارے نام کچھ خطوط باہر ڈیوڑھی میں آئے ہوئے ہیں۔ اور وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر سنا کہ وہ سنسر کے لئے بھیج دیئے گئے ہیں پھر دوبارہ سنا کہ خطوط آتے ہیں اور سنسر کے لئے چلے جاتے ہیں اور وہاں سے لوٹ کر نہیں آتے ایک مہینہ سے زائد عرصہ گزر گیا ہے اور کوئی خط کہیں سے نہیں ملا۔ اب تک نہیں ملا۔ نہ فرید کا خط اس کے باپ کو ملا۔ نہ فاروق کا خط اس کے والد کو ملا اور نہ ارشاد اور بلو کے خطوط ان کے ابا کو ملے۔ ان کے خطوط میں پتہ نہیں انقلاب کا وہ کون سا ایٹمی نسخہ ہے جس کے خوف سے وہ خطوط روک لئے گئے ہیں۔ جس شخص کی میز پر وہ خطوط کئی دن سے پڑے

ہیں۔ کیا اسے معلوم نہیں ہے کہ وہ بھی انسان ہے اور انسان کو اسی لئے تو انسان کہا جاتا ہے کہ اس میں انسانیت ہوتی ہے اور اسے اپنے باپ آدم کے بچوں یعنی اپنے بھائی انسانوں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قابیل کی اولاد ہابیل کی اولاد سے اب تک انتقام لے رہی ہے۔

لیکن ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ مطلق نہیں۔ جو راستہ ہم نے اختیار کیا ہے اس کے تقاضوں سے ہم پہلے دن سے باخبر تھے اور کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ توقع نہیں باندھی تھی کہ یہ کوئی پھولوں کی سیج ہے بلکہ اپنے مالک کی جو جو کرم نوازیاں یہاں آکر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اپنے ہاتھوں سے چھُو کر محسوس کی ہیں۔ ان کا تو کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے مالکِ حقیقی کے قرُب کا شدید احساس جتنا ان حالات میں ہوتا ہے باہر کی مصروف زندگی میں شائد ہی کبھی ہوتا ہو۔ آزادی میں جو کیفیت قربِ الٰہی میں بندے کو تہجد کی نماز میں محسوس ہوئی ہے، وہ کیفیت یہاں تقریباً ساری ہی نمازوں میں حاصل ہوتی رہتی ہے۔ ؎

فغاں سے تنگ نہ سیلِ بلا سے خانہ خراب
دل ایک بادشہِ بحر و بر ہے کیا کہیئے!

(قافلۂ سخت جاں)

۱۹۶۴ء

وارداتِ زنداں

محبِ عزیز۔ اللہ تعالیٰ تمہیں آفاتِ سماوی و ارضی سے محفوظ رکھے۔ دل کے چشمے سے جو کچھ اُبلتا ہے تمہیں لکھ بھیجتا ہوں اور جب کچھ اُبلتا ہے تو تمہیں لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ قید خانہ بھی عجیب مقامِ کیفیات ہے۔ اسے عالمِ برزخ سے تشبیہ دیں تو اس کی خصوصی کیفیات کے اعتبار سے بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ اعراف والوں کے بارے میں بھی قرآن کہتا ہے کہ ان کے اور کفار کے درمیان ایک دیوار کردی جائے گی جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب۔ کتنی ہی باتیں ہیں جو عزیز و اقرباء اور دوست احباب سے کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے۔ کتنی ہی ان کی خبریں ہیں جو سننا چاہتے ہیں لیکن کوئی خبر ان کی طرف سے یہاں نہیں پہنچتی۔ آدمی گو مگو کے عالم میں اس مقفل چار دیواری کے اندر ڈولتا پھرتا رہتا ہے۔ انسان اگر محشرِ خیال ہے تو حقیقتاً

اس محشر کا طوفان یہاں آکر امنڈتا ہے۔ اس خیالستان کا پھاٹک یہاں آکر کھلتا ہے۔ جو آدمی کی ہستی میں چھپا رہتا ہے اور یہاں آکر پتہ چلتا ہے کہ وہ آزادی کتنی قیمتی ہے جو انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کی پیدائش کے ساتھ ہی مفت دے کر بھیجا ہے۔ اپنی ملت اپنے ملک اپنے نظریات اور اپنے تصوراتِ حیات کی آزادی کے لئے جد وجہد کرنے والے لوگ ان چیزوں کے اس وقت تک محض نظری علمبردار ہوتے ہیں جب تک قید خانہ سے باہر ہوتے ہیں لیکن جب ایک بار قید خانہ کے پھاٹک کے اندر داخل ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنے ان نظریات کی قدر و قیمت افادیت ضرورت اور اہمیت کا پورا پورا احساس ہو جاتا ہے۔ یعنی پہلے اگر انہیں اپنے نظریات پر ایمان باللسان تھا تو اب تصدیق بالقلب کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ پہلے اپنے مقصدِ حیات کے حق ہونے پر ان کے پاس صرف الفاظ کے ذخیرے تھے تو اب انہیں اس پر عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے جس کام کے لئے آدمی ایک بار جیل ہو آتا ہے بشرطیکہ اس نے اسے شعور کے ساتھ زندگی کا نصب العین بنایا ہو تو اس کام کے لئے اخلاص، ایثار و قربانی محنت و جانبازی و جانسپاری دلسوزی و دلگدازی کی بے شمار دولت لے کر وہ واپس آتا ہے۔ یہ نعمتِ اوّل ہے جو قید خانے میں آکر کسی بامقصد آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کاغذ کے پھولوں میں بھی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں لُو کے جھونکوں میں بھی نسیمِ سحر کی خنکی اتر آتی ہے۔ یہاں ٹمٹماتے تارے بھی پُر نور ہو جاتے اور بھٹکے ہوئے راہیوں کے راستے روشن کرنے لگتے ہیں۔ یہاں شبنم کے جگر میں بھی فولاد کی سختی آجاتی ہے اور فولاد کے سینے میں بھی شبنم کا دِل دھڑکنے لگتا ہے یہاں لوہا تپتا ہے اور پھر اپنے مقصد کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور پھر سرد ہو کر ثبات و استقامت کا نقش کالحجر

بن جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے قید خانے میں داخل ہوتے ہوئے خوب کہا تھا کہ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ میری جنت تو میرے سینے میں ہے جو مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ قید میرے لئے خلوت ہے۔ قتل میرے لئے شہادت ہے۔ جلا وطنی میرے لئے سیاحت ہے۔ اگر میں قلعہ بھر دولت بھی دیتا تو وہ اس نعمت کے برابر نہ ہو سکتی تھی جو مجھے یہاں میسر ہے۔ اس قید کے سبب جو بہتری مجھے ملی ہے اس کا کوئی بدلہ نہیں محبوس تو وہ ہے جس کا دل اللہ کی یاد سے محبوس ہو جائے اور اسیر وہ ہے جو خواہشات نفس کا اسیر ہو جائے۔"

ایک دوسری نعمت ہے اور بلاشبہ وہ بہت بڑی نعمت ہے جو یہاں آکر حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے مالک کے ساتھ دل کی حضوری کی بے پناہ کیفیت ہے۔ تم حیران ہو گے کہ جو انسان آزاد اور مصروف دنیا میں اپنے مالک کے حضور اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور اس کا قلب بے نور و غیر متحرک اور منجمد رہتا ہے جس طرح سطحِ آب پر کوئی بچہ نلکی سے بلبلے اٹھا رہا ہو لیکن دریا کے گہرے سینے کو خبر تک نہ ہو جس طرح کوئی شخص سمندر کی سطح پر دیا سلائی جلا رہا ہو اور اندر کی تاریکیاں تاریک تر پڑی ہوں۔ بس یہی ایک کیفیت مدتوں تک عبادات میں بندوں پر رہا کرتی ہے۔ انسان ترستا رہتا ہے کہ اس کی نماز کو حضوری میسر آئے۔ اس کے دل میں گداز اور حرکت ہو۔ اس کے اندر خروش ہو۔ اس کے سینے میں عجز و نیاز کی کوئی ہانڈی ابلے۔ خشک آنکھیں تر ہوں۔ کسی زبردست محیطِ بے پناہ اور بے نہایت ہستی کے سامنے حضوری کا احساس وجود پر کپکپی بن کر تھرتھرائے۔ ہونٹ کانپیں اور وجودِ انسانی کا خشک پتھر پھٹے اور اس میں سے خشیتِ الٰہی کی پُرآب نہریں جاری ہوں لیکن انتظار بس انتظار ہی رہتا ہے اور آزاد

مصروف شخص کا دماغ مدتوں اس کیفیت کے ہجر میں اپنے دل کی اس پتھریلی حالت پر غور کیا کرتا ہے۔ گویا کہ وہ مٹی کا ایک بے نور بوجھل ڈھیلا ہے۔ گویا کہ وہ پتھر کا بے روح ریزہ ہے۔ گویا کہ وہ لوہے کا بے گداز ٹکڑا ہے لیکن یہاں اللہ کی طرف سے وہ نعمت جانفزا اترتی ہے جسے سوز و گداز اور حضوری قلب کہا جاتا ہے۔ یہاں مٹی کے ڈھانچوں کے اندر دل گداز ہو کر موم ہو جاتے ہیں اور آتش دروں کے سوز سے موم بتی کی مانند جلنے پگھلنے اور بہنے لگتے ہیں۔ سنگریزے کی مانند بے روح دل معصوم بچے کی مانند دھڑکنے کانپنے اور تھرتھرانے لگتے ہیں۔ فولاد کی مانند سخت دل پارۂ سیماب کی طرح سراپا اضطراب بن جاتے ہیں۔ محشرِ خیال انسان اپنے اندر کتنے ہی طوفان اُٹھتے۔ اُبھرتے اور پھیلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ جن کی بلند لہریں آنکھوں کے ساحلوں سے بار بار آکر ٹکراتی اور اکثر باہر چھلک پڑتی ہیں۔ یہ نعمت بارہا میسر آتی ہے پیہم آتی ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ میں وہاں ہوں جہاں اسے اپنے مالک کے سوا اور شائد کسی شے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کا مالک حقیقتاً اس کی رگِ گلو سے قریب بہت قریب اس کی ایک ایک سانس اس کی ایک ایک آرزو اور سرگوشی اور اس کے ایک ایک خیال تصور اور بے تابی و اضطراب کو اتنا قریب سے دیکھ رہا ہے کہ پھر ہونٹوں کے ہلنے۔ الفاظ کے بننے اور اظہارِ مدعا تک کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

دل کی دنیا میں بہار کا یہ موسم بار بار یہاں آتا ہے اور آدمی بار بار اپنے مالک کے سامنے سجدۂ شکر بجالاتا ہے کہ وہ اپنے لڑکھڑا کر چلنے والے بندے کی طرف اس طرح پورے طور پر متوجہ ہے کہ گویا مالک کی ساری توجہات صرف اسی ایک پر ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

یہاں ایک اور محبوب شے اپنے گذشتہ اور موجودہ احباب و اعزہ و اقربا اور محبین کی یادیں ہیں جو ساون کے بادلوں کی طرح امنڈ امنڈ کر آتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی سہانی شخصیت دل میں محبت اور انس پیدا کرتی ہے۔ ان کی خامیوں کی پردہ پوشی اور دعا اصلاح اور ان کی اچھائیوں کے لئے جزا و ثواب کی دعائیں نکلتی ہیں۔ ان سے محبت و الفت کا رشتہ غائبانہ طور پر دلوں میں راسخ سے راسخ تر ہوجاتا ہے۔ وہ جو اس زنداں سے باہر ہیں اور خوف و ہراس، وحشت گردی اور مصائب کے گرد و غبار میں اپنے نصب العین پر نگاہیں جمائے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے قدموں کے لئے ثبات کی اور ان کے حوصلے، باہمی ربط و تعلق، خدا ترسی اور تحریکی وابستگی کی دعا بے اختیار دل سے نکلتی ہے۔ ان میں سے ایک ایک کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے میدانِ سعی و عمل میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں لیکن مصروفیت کے غبار نے کبھی ان کے بارے میں غور و فکر، ان کے پُر محبت تعلق کے بارے میں گہرے تاثرات حاصل کرنے کا کبھی موقعہ نہ دیا تھا وہ موقعہ یہاں میسر آتا ہے۔ پھر وہ دوست یاد آتے ہیں جو اس میدانِ جہاد میں اپنے درخشاں نقوشِ عمل ہم بے عملوں کے لئے چھوڑ کر آگے گزر گئے ہیں اور اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ چوہدری علی احمد خان، محمد باقر خان، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر تاج الملوک اور کتنے ہی وہ گمنام مجاہدین تحریکِ اسلامی ہیں۔ جو اپنا کام کر گئے اور اپنے مالک کے پاس سرخرو ہو گئے۔ ان کے لئے مغفرت اور جنت میں درجاتِ عالیہ کی دعائیں نکلتی ہیں۔ گہرے تاثر کے ساتھ پُرنم آنکھوں کے ساتھ اور محبت و غم خواری کے ساتھ وہ سب یاد آتے ہیں۔ ان کے کام۔ ان کی باتیں۔ ان کا ایثار و قربانی اور تحریکِ اسلامی کے لئے ان کا والہانہ جذبۂ عمل یاد آتا ہے اور دل اور آنکھیں ان کی یاد اور محبت سے گداز ہوجاتے ہیں ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کرتے

ہوئے اپنی کمزوریاں اور مالک کے حضور اپنے عمل کی کوتاہی یاد آتی ہے تو دل امنڈ آتا ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور لب بار بار ان کے لئے دعائیں کرتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ شاید ہم بھی جب اس جہانِ عمل سے اُٹھ جائیں اور جب عمل کے سارے سلسلے منقطع ہو جائیں تو ہمارے پیچھے رہ جانے والے ساتھی ہمارے لئے بھی کلمۂ خیر کہیں ہمارے لئے بھی یونہی دعائیں کریں اور بلاشبہ آگے چلے جانے والے ساتھی کے لئے جہاں دعائے مغفرت کے سوا اور کوئی ہدیہ نہیں جا سکتا۔ یہ ہدیہ بہت بڑا ہدیہ ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ساتھی بھی ہمارے بعد ہمیں یہ ہدیہ ارسال کریں۔ اس خیال سے دل موم ہو جاتے ہیں اور ہونٹ کانپنے لگتے ہیں۔ یہ بھی ایک دلگداز لذت ہے جو یہاں میّسر آتی ہے۔

(قافلۂ سخت جاں)

۱۹۶۴ء

اجنبی کی آمد

چین میں اشتراکی انقلاب مکمل ہو گیا تھا چیانگ کائی شیک دم توڑ رہا تھا۔ اشتراکیت نے پورے چین کو اپنے دامن میں لے لیا تھا اور شمال کے ساتھ اب مشرق سے بھی اشتراکیت آلود ہوائیں چلنے لگی تھیں۔

اشتراکیت شاداں و فرحاں ہواؤں کے دوش پر ایک فاتح کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی تھی۔ چین سے ایک تند و تیز جھونکا آیا جس پر کمیونزم سوار ہو کر آیا تھا۔ وہ اپنے عالم تصور کے مفتوحہ ممالک کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس جھونکے کے دوش پر برما اور رنگون کی سیر کی تھی۔ آسام کے جنگلوں میں بھٹکا تھا۔ ملایا کے ربڑ کے جنگلات میں گوریلا وار لڑنے کے منصوبے بنائے تھے اور انڈونیشیا کو تاکا تھا۔

پھر بھارت میں تلنگانہ کا جائزہ لیا۔ کیرالہ میں ٹھہرا۔ مدراس کے دیہاتوں اور

قصبوں کو کھنگالا اور ریاست ٹرا ونکور اور کوچین کو اپنے لئے زرخیز پایا۔ آندھرا کے میدانوں میں تگ وتاز کی اور پھر اپنے ہوائی گھوڑے پر شمال مغرب کی طرف چلا گیا۔

اچانک ایک دل دہلا دینے والے اور رگوں کا خون خشک کر دینے والے حکم نے اسے ایک مملکت کی سرحد پر روک دیا۔

"یہ اجنبی کون ہے جو اس سرزمین میں داخل ہو رہا ہے" آواز میں سنجیدگی۔ وقار پاکیزگی۔ متانت اور رعب تھا۔

"میں کمیونزم ہوں اور اپنے مفتوح ہونے والے ممالک کا دورہ کر رہا ہوں۔ تو کون گستاخ ہے جس کی جان اتنی ارزاں ہے کہ کمیونزم کو روکنے کی سعیٔ رائیگاں کر رہا ہے"!

ایک چنگھاڑ۔ گرج۔ چیخ اور ہولناکی کے امتزاج نے جواب دیا۔

"میں اس سرزمین کا مالک ہوں۔ میں اس سرزمین کے فرزندوں کا دین ہوں۔ یہ سرزمین میرے ہی لئے حاصل کی گئی ہے۔ میں اسلام ہوں" ایک پُرعزم جواب تھا۔

"یہ انفرادی ملکیت کا تصور میرے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے جو زمین پر سرزد ہو سکتا ہے۔ راستہ صاف کرو۔ میں آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کا نجات دہندہ ہوں۔ ورنہ سائیبریا کے جہنم زاروں میں تجھے اور تیرے لاڈلے فرزندوں کو ایڑیاں رگڑنی ہونگی" شیطانی چنگھاڑ نے دھمکایا۔

"میرے عزیز دوست۔ راستے جبر سے صاف نہیں ہوا کرتے اور ہو جائیں تو بہت جلد پٹ جاتے ہیں۔ فکری راستے نظریات کی فتح سے صاف ہوتے ہیں۔ جس انسانیت کی نجات دہندگی کا علم لئے ہوئے تم آگے بڑھ رہے ہو۔ اس انسانیت کو تم نے کیا دیا ہے۔" اسلام نے پوچھا۔

" روٹی " جواب ملا۔

" روٹی تو اس جہان کا ہر ذی روح کھاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک معمولی حیوان اور چوپایہ بھی۔ تم نے انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرنے کے لئے کیا دیا ہے؟" پوچھا گیا۔

" اس سے زیادہ مانگنا اور اس سے زیادہ سوچنا میرے نزدیک پرولتاری انقلاب کے خلاف بغاوت ہے اور ایسے باغیوں کو مزہ چکھانا میں خوب جانتا ہوں۔ تم میرا راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ شور نہ مچاؤ۔ تم کسی بورژوا تہذیب کے بوڑھے چوکیدار معلوم ہوتے ہو۔" کہا گیا۔

"یہ ملک میری کھیتی ہے۔ میں نے یہ ملک نیکی کا نظریاتی بیج بونے کے لئے حاصل کیا ہے میں اس کا رکھوالا ہوں۔ میں اس میں کسی ناپاکی کو داخل نہ ہونے دوں گا۔ اپنے ملک کی حفاظت میں مر جانا میرے مسلک میں شہادت ہے۔ اور شہادت وہ موت ہے جس کی تمنا میرے ہر فرزند کے سینے میں ہمیشہ پرورش پاتی رہتی ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ واپس جاؤ اور اپنی پناہ گاہ کو مضبوط کرنے کی فکر کرو جہاں میں نیکی کی فصل اُگا کر اخلاق کے اسلحہ سے تم پر حملہ آور ہونے والا ہوں۔ جاؤ۔" ایک پُر عزیمت آواز نے حکم دیا۔

اور اجنبی واپس پلٹ گیا۔

" اچھا میں اپنی مصلحت کے تحت ابھی واپس جاتا ہوں۔ میں اپنے خفیہ دستے تیار کر کے یہاں دوبارہ یلغار کروں گا۔ میں اپنے جبری کیمپوں کے لاکھوں مزدوروں کے ذریعے تمہاری اس کھیتی کو تاخت کروں گا۔ میں اس سرزمین کے فرزندوں کو آپس میں لڑاؤں گا۔ ان میں ہزار ہا اختلافات اور فتنے جگاؤں گا۔ پھر تم دیکھ لینا کہ زیادہ قوی کون ہے اور کس کا سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ تمہاری یہ قلعہ بندیاں میرے سامنے ریت کی دیوار

بن جائیں گی۔" جاننے والے نے کہا۔

" پریشان اجنبی! تمہیں اب تک فکر اور اصول سے پالا نہیں پڑا صرف نعروں سے واسطہ رہا ہے۔ تم نے قومیت کی چٹانوں کو توڑا ہے۔ لیکن تم اپنا ہتھوڑا کسی صالح نظریہ پر چلا کر اسے توڑ نہیں سکتے۔ اس کے لئے تمہیں نظریات کے میدان میں جیتنا ہوگا۔ جاؤ اور انتظار کرو۔ میں بھی منتظر ہوں۔ جب ہم ایک بار فیصلہ کن انداز میں معرکہ آرا ہوں گے۔"

محافظ نے کہا۔

اجنبی خاموشی سے واپس جا چکا تھا۔ رُوحِ اسلام اپنی نظریاتی مملکت پر پہرہ دے رہی تھی۔

(پکار)

۱۹۵۲ء

دِل میں ایک جگہ

میرے دل میں ایک جگہ خالی پڑی ہے ۔ یہ جگہ اب بھی کبھی کبھار اپنے مکین کی یاد دلاتی ہے تو شکست خوردہ احساسِ رفاقت آنسوؤں کے چند قطرے پھولوں کی مانند بچھڑے ہوئے دوست کی قبر پر ٹپکا دیتا ہے ۔ یہ جگہ کبھی میرے اس محترم دوست اور محبوب رفیق کو حاصل تھی ۔ جو اب روٹھ گئے ہیں ۔ اس مقصد سے روٹھ گئے ہیں ۔ جو میری رگوں کا خون اور میرے دل کی دھڑکن ہے ۔ اس نصب العین سے روٹھ گئے ہیں جس نے ہم دو اجنبیوں کو دوست رفیق اور ساتھی بنا یا تھا ۔ اس منزل سے رُخ موڑ گئے ہیں جو ہم دونوں نے سوچ سمجھ کر زندگی کے خاتمے تک کے لئے منتخب کی تھی ۔ اس لئے میرا اور ان کا راستہ الگ ہو گیا ہے ۔ میں اور وہ دونوں پھر اجنبی ہو گئے ہیں ۔ میری اور ان کی راہ و رسم ختم ہو گئی ہے ۔ میرے اور ان کے درمیان زندگی بھر کا طول طویل فاصلہ حائل ہو گیا ہے ۔ جس دوست کو میں

رفیقِ مقصد کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ نہ رہا تو پھر اس میتسے اس ڈھانچے کو کیا کروں۔ روح نکل جانے کے بعد تو کسی کی ماں بھی چند گھڑیاں اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتی۔ جو میرے محترم رفیق ہونے کے سبب میرے دوست تھے۔ جب وہ رفیق ہی نہ رہے تو میں ان کو کیا کروں جو ان کا نام اپنے ماتھے پہ چپکائے شہر کی سڑکوں پر پھرتے ہیں۔ اور میرے لئے اتنے اجنبی ہیں کہ میں ان کو پہچانتا بھی نہیں۔

میں نے اپنے بچھڑے ہوئے محترم دوست کی خالی کردہ جگہ کو اپنے مقصد کے لئے مصروفیتوں کے انبار سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں۔ لیکن بس ایک حد تک۔ اس کی آواز کسی نہ کسی لمحے کسی نہ کسی گھڑی، کبھی نہ کبھی ضرور ہی غنچے کی چٹک کی طرح دل کی گہرائیوں میں گونج جاتی ہے۔ اور پھر محسوس ہوتا ہے کہ جسے میں نے مردہ سمجھ کر ماضی کے قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ وہ اب تک زندہ ہے۔ کروٹیں لے رہا ہے اور پھر شائد کہیں آملے۔ کبھی آملے۔ یہ تصور دل دھڑکا دیتا ہے۔ پھر کافی دیر تک میری حرکت قلب تیز رہتی ہے۔ جیسے وہ جو یوں چُپ چُپ روٹھ کر چلا گیا۔ وہ جو کبھی نہ بچھڑنے کا وعدہ کیا کرتا تھا۔ لیکن بچھڑ گیا۔ شاید پھر پلٹ کر آ رہا ہے اور یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔ دھک دھک۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میرے دل کی دھڑکن ہے۔ اور یہ محض ایک واہمہ ہے

مجھے اب تک کوچہ پنڈت دہلی کے ہفتہ وار اجتماعات میں اس کی شرکت یاد ہے جب کبھی وہ لکھنؤ سے آیا کرتا تھا۔ اپنے روئے خنداں کے ساتھ۔ اپنی دلچسپ باتوں، متعقد حرکات اور پختہ عزائم کے ساتھ تو ہم سب بہت خوش ہوا کرتے "اخاہ! لکھنؤ والے دہلی آئے ہیں" ہم دوست آپس میں مسکرا مسکرا کر معنی خیز انداز میں کہا کرتے۔ ممتاز صاحب اپنے خاص استادانہ انداز میں ان کو عربی پڑھانے کی دھمکیاں دیا کرتے۔ اقبال صاحب ان سے

راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے۔ اور وہ چند اجتماعات میں شرکت کے بعد پھر کچھ عرصے کے لئے لکھنؤ چلے جایا کرتے۔ وہ لکھنؤ والوں کے لئے دلّی والے تھے۔ اور دلّی والوں کے لئے لکھنؤ والے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں وہ بہت اللہ والے تھے۔

پھر اس سے آگے مجھے ان کی الہ آباد کے اجتماع پر طعام گاہ میں کھانا کھلانے کی ڈیوٹی خوب یاد ہے۔ کس کس طرح وہ دوڑ دوڑ کر دوستوں کو کھانا فراہم کرتے تھے۔ سفید پاجامہ اور ململ کا کرتہ پہنے، مسکراہٹ کے ساتھ پریشان چہرہ لئے وہ مستعدی سے اپنا کام کرتے پھر رہے تھے۔ اور اجتماع بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ دہلی کے دوست زیادہ بہتر کھانا پکواتے اور کھلاتے ہیں اس لئے ایسے مواقع پر مطبخ اور طعام گاہ کی ڈیوٹیاں انہیں کے سپرد کی جائیں چاہیے اس اجتماع میں دہلی والوں نے اپنے کام کی کوئی تسلی بخش رپورٹ پیش نہ کی تھی لیکن اپنے لئے مطبخ اور طعام گاہ میں مقام پیدا کر لیا تھا۔ اور شائد اس مقام کے حصول میں ان کی محنتوں کا حصہ بھی کم نہ تھا۔

پھر مجھے یاد آتا ہے جب ہم ملیر کی سہ ماہی پکنک پر گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں سارے احباب نے ایک مجلس میں باری باری اپنے مقصدِ زندگی سے تعارف کا سب سے پہلا تاثر بیان کیا تھا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ اور طویل نشست تھی۔ قبولیتِ دعوت کے لیئے قدرت نے ہر ہر شخص کو کس کس طرح مختلف زاویوں سے لا لا کر یہاں کھڑا کر دیا تھا۔ یہ ایک نہایت حیرت ناک مطالعہ تھا۔ انہوں نے بتایا۔ میں حج کے لئے گیا۔ تو کسی دوست نے کچھ کتابوں کا بنڈل مطالعہ کے لئے میرے حوالے کیا۔ اور جب جہاز میں میں نے ان کا مطالعہ شروع کیا۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات تھی۔ جو مصنف کہہ رہا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ ان کتابوں کا مصنف کوئی زندہ ہستی ہے۔ یا کوئی قدیم بزرگ

ہیں - اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ واپسی پر یہی کام کروں گا ۔ اگر وہ بزرگ نہ ملے تو پھر انہیں خطوط پر ایک تحریک اٹھاؤں گا ۔ اور تمام عمر اسی راہ میں کھپا دوں گا ؛ میں ان کے بیان سے بہت متاثر ہوا تھا - اس لیئے کہ جب میں نے خود ان کتب کا مطالعہ بالکل ابتدائی طور پر شروع کیا تھا تو مجھے بھی علم نہ تھا کہ ان کا مصنف کون کہاں اور کس حال میں تھا ۔ لیکن جب اس کام کے وزن کو سامنے رکھ کر میں نے اپنے آپ کو اس مقام پر رکھ کر تولا تھا ۔ تو حقیقت یہ ہے کہ میرے اندر ہمت نے جواب دے دیا تھا ۔ اور مجھے اس کام میں اور اپنے آپ میں پہاڑ اور کنکر کی نسبت محسوس ہوئی تھی ۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اگر کوئی قافلہ اس راہ پر چل پڑے ۔ تو شاید میں اس قافلے کی گرد راہ بن سکوں ۔ اور یہی میرے لیے بہت بڑا فخر تھا ۔ لیکن ان کے ان الفاظ نے کہ وہ خود واپسی پر ایک داعی کی حیثیت سے اس کام کو کرنے کا تہیہ رکھتے تھے ۔ میری نظر میں ان کا مقام بے حد بلند کر دیا تھا ۔ آج وہ کام بھی موجود ہے ۔ ملک بھی موجود ہے ۔ نصب العین بھی موجود ہے ۔ لیکن وہ موجود نہیں ہیں ۔ وہ کارزارِ حیات میں کھو گئے ہیں ۔ وہ گردِ راہ بننے کے قابل نہ تھے لیکن گردِ راہ بن گئے ہیں ۔ وہ چھوڑنے اور بھلانے کے قابل نہ تھے ۔ لیکن چھوڑ گئے ہیں ۔ اور بھول بھلا گئے ہیں ۔ بس دل کے ایک گوشے میں ان کی یاد کا ایک مدفن ہے ۔ جس پر شکست خوردہ احساسِ رفاقت کبھی کبھار یادِ ماضی کے چند آنسو مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح ٹپکا دیتا ہے ۔

دوست کہا کرتے تھے کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے ۔ حقیقتاً ان کو دیکھ کر خدا یاد آیا کرتا تھا ۔ ان میں آج بھی اگر زندگی کی کوئی ایسی رمق موجود ہو جو اپنے ماضی سے منحرف نہ ہوئی ہو تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کی زندگی کا وہ دَور خدا ترسی اور قربتِ حق کے لحاظ سے آج سے بہت آگے تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ جب ایک ہنگامی موقعہ پر تحریک کی بھاری ذمہ داری

ان پڑ ڈالی گئی تو احساسِ ذمّہ داری سے وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور اس طرح بلک رہے تھے جس طرح انہیں کُند چھُری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ جیسے کوئی بکری بچڑ خانے کی طرف گھسیٹ کر لے جائی جا رہی ہو۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھ پر منکشف ہو گیا تھا کہ اس بھاری کام میں جو بلا شبہ ان کی صلاحیتوں سے بہت اُونچا تھا۔ تائیدِ ایزدی انہیں یقیناً حاصل ہو گی۔ میرا ووٹ ان کے خلاف گیا تھا، لیکن میرا دل ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے کے لئے میں مشرقی پاکستان چلا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کا جو علاقہ میرے حوالے تبلیغی مقاصد کے لئے کیا گیا وہ شمالی حصّہ تھا۔ اور میرا سب سے پہلا ہیڈ کوارٹر پاربتی پور تھا۔ میں کراچی سے گیا تھا اور میرے ساتھ میری بیوی اور ۴ سالہ بچّہ بھی تھے۔ کراچی کے اگر کسی غلیظ ترین محلے کا تصوّر کیا جا سکتا ہے تو پاربتی پور اس سے کہیں بڑھ کر گندا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بارش کا موسم تھا۔ دوستوں نے بڑی مشکل سے جو مکان میرے لئے تلاش کیا تھا وہ قصبے کا سب سے گندا حصّہ تھا۔ اخلاقی لحاظ سے بھی اور مادی لحاظ سے بھی۔ وہ مکان بھی ان خصوصیات میں کم نہ تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے مکان تک بارش کے دنوں میں ٹخنے ٹخنے کیچڑ میں چلنا پڑتا تھا اور شہر کی اخلاقی لحاظ سے سب سے گندی گلی میں سے گزر کر اس کے عقب پر جانا پڑتا تھا۔ کراچی اور پاربتی پور میں آسمان سے لے کر کھجور تک کا فاصلہ تھا۔ احباب کی مجلسیں۔ ادبی سرگرمیاں، جماعتی گہما گہمی۔ صفائی ستھرائی۔ حلقۂ احباب، زبان، لباس۔ آب و ہوا سب کچھ بارہ سو میل پیچھے رہ گیا تھا۔ پہلے پہل ہم وہاں پہنچ کر کافی پریشان ہوئے۔ ایک بڑے امتحان میں مبتلا ہوئے تھے۔ میرے ذمّے کام بھی کچھ مختلف نوعیّت کا تھا۔ شہر کی جامع مسجد میں درس اور ہفتہ وار اجتماعات کی ابتداء۔ مقامی منتشر احباب سے رابطہ۔ ان کی تنظیم۔ تربیت اور ایک منظّم حلقے کا قیام اور یہ کام دو ماہ کے اندر مکمّل کر کے دوسری جگہ منتقل ہونا اس کے علاوہ اردگرد کے شہروں

میں کام کی ابتدا اور گداگری ۔ ہمارا پورا مختصر خاندان عجیب و غریب صورت حال سے دوچار تھا بہرحال کام کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے تھے۔ کہ چند دنوں کے بعد ہی عیدالفطر آگئی۔ اس پردیس اور ایسے حالات میں عید اور بھی کس مپرسی کی بن گئی کہ ڈاک میں ان کا اور ان کی اہلیہ کا عید کارڈ پہنچا۔ خط پا کر ہی ہم نے محسوس کیا کہ جیسے دونوں میاں بیوی ہماری ملاقات کے لئے دُور دراز کا فاصلہ طے کر کے ہمارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ اس عید کارڈ پر لکھے ہوئے الفاظ آج بھی میرے دل پر کندہ ہیں۔ "ایک اسلامی مشنری خاندان کے نام جس کو لوگ بھولے نہیں ہیں"

یہ احساس کہ لوگ ہمیں بھولے نہیں ہیں ہمیں پہروں مسرت کے جھولوں میں جھلاتا رہا۔ لوگ چاہے بھولے ہوں یا نہ بھولے ہوں لیکن وہ تو ہمیں یقیناً نہیں بھولے تھے۔ اور انہوں نے عید کے دن ہمیں سب سے پہلے یاد کیا تھا۔ آج بھی اس کی یاد سے دل میں مسرت اور خوشبو کی لہریں سی اٹھ جاتی ہیں۔ محترم دوست بات یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ خود ہی اپنے احباب کو بھول کر چلے گئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ آپ کے احباب اب بھی آپ کو بھولے نہیں ہیں۔

پھر ایک موقعہ آیا جب وہ روٹھے روٹھے رہنے لگے۔ یہ دَور ان کی ذہنی اور رُوحانی بیماری کا تھا۔ میرا بارہا جی چاہا کہ ان سے کھل کر بات کروں اور ان کی بیماری معلوم کروں۔ اگرچہ بیماری مجھے معلوم تھی۔ اس لئے کہ وہ وبائے عام تھی۔ پھر وہ چپکے سے اٹھے اور ہماری مجلس سے رخصت ہو گئے۔ رُوٹھ گئے، چلے گئے جو کہتے تھے کہ ہمارا تمہارا زندگی اور موت کا ساتھ ہے۔ وہ بے موت مر گئے۔ وہ بے اجل اُٹھ گئے۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر ہی چھوڑ گئے۔ ان سے یہ توقع نہ تھی لیکن وہ خلافِ توقع ہی یہ کام کر گئے۔

ان سے محبت تھی، لیکن وہ محبت کو توڑ کر پھینک گئے۔ وہ دل میں سے اپنا مقام چھوڑ کر خود چلے گئے۔ جب وہ چلے ہی گئے تو میں نے اس خالی جگہ کو پوری ہمت وجرات سے مقصدِ زندگی سے بھر دیا۔ ان کے لئے کوئی نرم گوشہ وہاں رہنے نہ دیا۔

وہ بھول گئے، وہ چوک گئے، وہ خطا کر گئے۔ وہ غولِ بیابانی کے چکر میں آگئے۔ وہ اندھے بگولوں میں کھو سے گئے۔ آج نہیں تو کل۔ یہاں نہیں تو وہاں حقیقت ان کے سامنے برہنہ ہوکر آجائے گی اور پھر وہ پچھتائیں گے کہ انہوں نے یہ کیا کر دیا۔ وہ کہاں بھٹکا دیئے گئے تھے۔ ایک دن انہیں محسوس ہو جائے گا کہ جس چیز کو انہوں نے اپنے جسم کے اندر سے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ وہ تو ان کے جسم کی روح تھی۔ انہوں نے تو اپنی روح کے خلاف ہی بغاوت کر دی۔ یہ کتنی بڑی بھول تھی۔

آج بھی میرے دل میں ایک جگہ خالی پڑی ہے۔ جو اپنے مکین کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ میں نے اسے مقصد کی مصروفیات کے انبار سے پُر کر دیا ہے لیکن ماضی کی ایک یاد دل کے اس گوشے میں اندر ہی اندر کروٹیں بدلتی رہتی ہے جیسے کوئی مردہ صبحِ قیامت کا منتظر ہو۔ جب کبھی یہ یاد آجاتی ہے تو شکست خوردہ احساسِ رفاقت آنسوؤں کے چند قطرے بچھڑے ہوئے دوست کی یاد میں مکین کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ پر ٹپکا دیتا ہے۔

(انتظار ۱۹۵۷ء)

مرحوم دوست

زمانے کی قسم، انسان خسارے میں ہے۔ اگر وہ کائنات کے مالک کا مطیع نہ ہو جائے۔ اس کے بھیجے ہوئے ہادی کو اپنا راہنما تسلیم نہ کرلے۔ اگر وہ حق پر جم نہ جائے اور حق پر جم جانے کی راہ میں وہ سب کچھ سہہ نہ جائے جو بے صبر و بے حوصلہ لوگوں کے قدم اکھاڑ دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کیا ہے؟ وقت کا ایک بے داغ کنوس، جو ماں کی گود سے قبر کے دہانے تک اس دنیا میں ہر انسان کے لئے کھنچا ہوا ہے۔ اس کنوس پر انسان اپنے ارادے اور شعور سے نقش و نگار بناتا چلا جاتا ہے۔ حق پناہی، صبر و ثبات، ہمدردی، تحمل، بردباری اور حقوق شناسی کے یا باطل پرستی، بے حوصلگی، خود غرضی، بے صبری، ظلم و جور اور حقوق تلفی کے۔ دونوں حالتوں میں زندگی کے کنوس پر جتنے نقش و نگار ابھر آتے ہیں۔ اس کے

اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور انہی نقش و نگار سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ محبت و احترام سے یاد رکھنے کے قابل ہے یا نفرت و حقارت سے۔ یا محض حیوانی زندگی گذار کر زمانے کے سینے پر ایک بے رنگ و بے آب نقش ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت متعین نہیں کی جاسکتی جسے خود اپنی زندگی کا شعور تک نہ ہو سکا۔

انسانی معاشرے کے انحطاط کے دور میں بے شعور زندگی گذارنے والوں کی کثرت ہوتی ہے۔ دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جو زندگی کے خاکے میں ظلم و جور اور نفرت و حقارت کا رنگ بھرتے ہیں اور تیسرے درجے پر انتہائی قلیل تعداد ان لوگوں کی آتی ہے جو انسانی زندگی کا جوہر ہوتے ہیں اور جنہیں زمانہ مدتوں بعد تک یاد کیا کرتا ہے اور ان کی زندگی کو نمونے کے طور پر اس کے بعد آنے والوں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے کہ اگر جینا ہے تو اس طرح جیو جیسے فلاں اور فلاں نے جی کر دکھایا۔

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے زمین دی ہے جس میں وہ اپنا رزق اگاتا ہے اور مادی اعتبار سے اس میں سے اپنی خوش حالی کے سامان پیدا کرتا ہے اور ایک زندگی دی ہے جو نظر نہ آنے والی غیر محسوس کھیتی ہے جس میں وہ اپنے اعمال کی تخم ریزی کرتا رہتا ہے اور جو جو کچھ اس میں بوتا رہتا ہے اس کے نیٹھے یا کڑوے پھل اسے یہاں بھی لوگوں پر اثرات اور ان کے ردِ عمل کی صورت میں تھوڑے بہت ملتے رہتے ہیں لیکن اس کی پیداوار کا اصل ذخیرہ اسے آخرت میں ملتا ہے جس پر اس کی گذران ہوتی ہے۔ آخرت میں اسے کیا کچھ ملتا ہے۔ اس کے اثرات اس دنیا میں بہت نمایاں ہوتے ہیں۔

چودھری علی احمد خان مرحوم کو جو اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک متعین مدت دی تھی اور

انہوں نے زندگی کے اس صاف کنویس پر جو انداز ۲۰، ۴۰ سال کے لمبے عرصے پر پھیلا ہوا تھا بہت ہی شاندار نقش و نگار بنائے۔ ایسے نقش و نگار جن کو دیکھ کر ہر دیکھنے والا کہہ دے کہ یہ قابلِ رشک کام ہے جو کرنے والا نے کیا ہے۔ یہ مومن کے لئے قابلِ تعریف یادگار ہے۔ یہ قیمتی فصل ہے جو انہوں نے اپنی کشتِ حیات میں بوئی ہے۔ اس کے پھل میٹھے ہیں، اس کے پھول خوشبودار ہیں اور اس کا حاصل لازوال ہے۔ اس بات کی گواہی وہ سب دیتے ہیں جو دنیا کی اس زندگی میں ان کے قرب وجوار میں رہے۔ ان سے مل کر کام کرتے رہے اور ان کو کام کرتے دیکھتے رہے۔

جب ایک نصب العین سامنے آگیا تو انہوں نے اندھا دھند اسے قبول نہیں کیا۔ اس کے باوجود کہ ان کی سلیم فطرت نے اس کے حق ہونے کی گواہی دے دی لیکن پھر بھی انہوں نے نصب العین، اصول اور طریقِ کار کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی ٹھونک بجا کر دیکھا جو یہ کام کرنے اٹھے تھے اس لئے کہ دنیا میں خوش نما اور دل فریب نعروں کی کمی نہیں رہی ہے۔ اصل چیز تو وہ کردار ہے جو کسی بات کا عزم لے کر اٹھتا ہے اور اس کے لئے خاص طرز کا مواد جمع کرتا ہے۔ جب وہ مطمئن ہو گئے تو پھر "شرعی عذرات"، اور دینی و دنیوی مصالح" کے کانٹے انہوں نے اپنے دل و دماغ میں پرورش پانے نہیں دیئے۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ جس نصب العین کی خدمت کا اقرار میں نے کیا ہے۔ وہ مجھ سے کم سے کم کتنا مطالبہ کرتا ہے اور اس کم سے کم سے بھی کن کن عذرات کی بنا پر میں بچ سکتا ہوں بلکہ انہوں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ اس کے لئے میں زیادہ سے زیادہ کیا قربانی و ایثار کر سکتا ہوں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ جو ان کے پاس رہا۔ انہوں نے ہمیشہ اسے قربانی کے لئے تیار رکھا۔ وہ رخصت کے نہیں عزیمت کے قائل تھے، عذر کے نہیں ڈیوٹی کے قائل تھے۔

مصلحت کے نہیں فرض کی ادائیگی کے قائل تھے۔ پیچھے رہنے کے نہیں۔ آگے بڑھنے کے قائل تھے۔ نظام باطل کے مقابلے میں مدافعت کے نہیں، اقدام کے قائل تھے۔ یہی کچھ وہ خود تھے۔ یہی کچھ وہ دوسروں سے توقع رکھتے تھے۔ جماعتی زندگی میں انہوں نے اس کا بہترین نمونہ پیش کرکے دکھایا۔

نصب العین نے بتایا کہ طاغوت کی چاکری اور حق کی اطاعت ساتھ ساتھ چلنا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے طاغوت کی چاکری پر لات مارکر اس کی دی ہوئی دستارِ فضیلت بر سرِ بازار اٹھاکر پٹخ دی۔ مقصد نے بتایا کہ اپنے رزق کو تنگ کرکے بھی تنظیم کی خاطر تمہیں زیادہ سے زیادہ وقت دینا ہوگا۔ انہوں نے اسے گوارا ہی نہیں کیا بلکہ اس میں وہ اپنے ساتھیوں سے آگے نکل گئے اور گھریلو آسائش کو تج دیا۔ مقصد کی اہمیت نے بتایا کہ علم کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ انہوں نے دوسرے فرائض کے ساتھ ساتھ شب و روز مطالعہ شروع کردیا اور اسلام کے ساتھ ساتھ دوسرے نظام ہائے حیات پر بھی کافی عبور حاصل کرلیا۔ مقصد نے تقاضا کیا کہ مبلّغ کا کام دوسروں تک دعوت کا پہنچانا ہے۔ تم مبلّغ بنے ہو تو پھر دعوت پہنچانے کا ڈھنگ سیکھو۔ تقریر کرنا سیکھو۔ وہ فطرتاً مقرر نہ تھے لیکن انہوں نے شب و روز کی محنت سے یہ کام بھی فرض کی ادائیگی کی خاطر سیکھا۔ مقصد نے کہا کہ اس نظریاتی دَور میں نصب العین کی وضاحت اور اشاعت کے لئے تصنیف و تالیف بھی ایک اہم کام ہے۔ انہوں نے اس کے لئے بھی کام شروع کردیا اور کافی صلاحیت بہم پہنچائی۔ غرض جس متاعِ بے بہا پر وہ عاشق ہوئے تھے۔ ان کا محبوب جو جو کچھ مطالبات ان سے کرتا چلا گیا۔ وہ لالاکر اس کے سامنے پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر جان بھی اسی کی راہ میں دے کر سرخرو ہوگئے۔

مجھے جب وہ پہلی بار ملے تو میں نے اندازہ کیا کہ وہ مطالعہ کے بے حد شائق تھے۔ کئی ایک اخبارات و رسائل وہ منگاتے تھے۔ کم از کم چار پانچ روزانہ اخبارات وہ پڑھتے تھے۔ پڑھنے میں وہ توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ کاغذ پنسل لے کر بیٹھتے تھے ضروری باتیں نوٹ کرتے تھے۔ خاص مقامات کو نشان لگاتے تھے۔ موضوع کے اعتبار سے اخبارات کے تراشے رکھتے تھے۔ کتابوں میں نشانات لگاتے اور ان پر حاشیے لکھتے تھے۔ کمیونزم کا مطالعہ انہوں نے بالاستیعاب کیا تھا اور اس کے اندر دیا ہر پراچھی طرح عبور تھا۔

تقریر کا ملکہ بھی انہوں نے بڑی محنت سے بہم پہنچایا تھا۔ جس موضوع پر تقریر کرتے اس کے لئے جگہ جگہ سے مواد فراہم کرتے۔ اس لئے فوری نوٹس پر وہ تقریر کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ وہ جگہ جگہ سے مواد جمع کرتے، نوٹس مرتب کرکے ان کی ترتیب لگاتے، اس ترتیب میں بار بار ردو بدل کرتے اور اس طرح بڑی تیاریوں کے بعد تقریر کرتے۔ کتابوں کے حوالے اور اخبارات کے تراشے ان کے ساتھ ہوتے۔ ہر بات بہت ٹھونک بجا کر صاف صاف پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ سہل ترین انداز بیان اختیار کرتے تھے الفاظ کو یوں ادا کرتے تھے جیسے ان کے حرف حرف کا تلفظ علیحدہ علیحدہ کرنا چاہتے ہوں۔ مخاطب کی بات غور سے سنتے تھے اور جب وہ اپنی بات ختم کرلیتا تو۔ "بھائی صاحب" کہہ کر اس کی بات کا جواب شروع کرتے۔ وہ مخاطب کی بالکل غلط بات کو بھی "بالکل غلط" کہہ کر نہیں کاٹتے تھے، بلکہ اپنی بات اس طرح اٹھاتے تھے کہ نہ تو مخاطب کے جذبات مجروح ہوں اور نہ کسی جگہ اس میں احساسِ کہتری پیدا ہو۔ وہ کافی کافی دیر تک گفتگو کر سکتے تھے اور جب کوئی شخص سمجھنے پر مائل ہو تو وہ سمجھانے کے لئے

ہر ممکن نفسیاتی ذریعہ اختیار کرتے تھے۔ کبھی کبھی مخاطب میں ذرا ضد اور ہٹ دھرمی دیکھ کر ان کی آواز میں سختی اور بلندی بھی پیدا ہو جاتی تھی جسے وہ بہت جلد محسوس کر کے قابو میں کر لیتے تھے۔

تحریر کی طرف ان کی طبیعت شروع سے ہی مائل تھی۔ لیکن تنظیمی معاملات نے ان کو کبھی دم نہ لینے دیا اور یہ ہر شخص کے بس میں نہیں ہے کہ وہ تنظیمی اور تحریری کاموں کو ایک ساتھ سنبھالے جائے۔ چنانچہ پہلی بار جب ان سے میری ملاقات ہوئی اور ان کو معلوم ہوا کہ میں کبھی کبھار لکھا بھی کرتا ہوں تو انہوں نے بھی مضامین لکھنے سے دلچسپی کا اظہار کیا اور مجھے بتایا کہ کوثر کے ایڈیٹر ان کے دوست تھے اور گاہے گاہے ان سے بھی مضمون لکھنے کا تقاضا کرتے رہتے تھے لیکن انہوں نے ابھی اس طرف توجہ نہ دی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے سب سے پہلا مضمون "اشتراکیت اور تہذیب مغرب" لکھا، جو "جہانِ نو" کے ابتدائی شماروں میں چند ایک اقساط میں آیا ان کے موضوعات ٹھوس علمی ہوتے تھے۔ دستوری، سیاسی، اشتراکی یا معاشی موضوعات انہیں خصوصاً بہت پسند تھے۔

ان کے لکھنے کا انداز بڑا محنت طلب بلکہ مشقت آمیز تھا۔ جس محنت سے وہ لکھتے تھے، اس محنت کا مقابلہ اس مزدور کی محنت سے کیا جا سکتا ہے جو عمارتی تعمیر پر لگا ہوا دن میں لاتعداد بار ٹوکری بھر کر سیڑھی کے اوپر چڑھتا اور پھر نیچے اترتا ہو۔ کسی موضوع پر بھی وہ اپنی پہلی کوشش سے کبھی مطمئن نہ ہوتے تھے۔ وہ لکھتے، اس کی تصحیح کرتے، پھر تصحیح شدہ کو نقل کر کے پہلی تحریر پھاڑ دیتے۔ پھر نقل شدہ کی تصحیح کرتے دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا جیسے وہ لکھتے پھاڑتے اور پھر لکھتے رہتے تھے۔ ردی کی

ڈگری بھر جاتی تھی۔ جب ان کا ایک صفحہ تیار ہوتا تھا۔ زبان اور خیالات کی اصلاح اور ترتیب میں وہ بڑی محنت اٹھاتے تھے۔ میں تو ان کی اس محنت کو دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ ایک تحریری کام کرنے والا آدمی ایسی ذہنی مشقت کیوں کر گوارا کرتا ہے جو کوفت کی حد تک جا پہنچتی ہے جو کچھ وہ لکھتے مجھے ضرور دکھایا کرتے تھے

چودھری صاحب ایک نہایت باذوق پُر مذاق دوست تھے۔ احباب کی محفل میں وہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور پُر لطف باتوں سے خود بھی محظوظ ہوتے اور دوسروں کو بھی کرتے۔ فراخ دل، فراخ دست اور فراخ حوصلہ آدمی تھے۔ تنگ دستی ان پر بار ہا آئی لیکن تنگ دلی ان کو چھو نہ گئی تھی۔ ہر شخص سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے اور اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے تھے۔ تحریکی کاموں میں انہوں نے بڑے، چھوٹے کا امتیاز نہ رکھا تھا۔ وہ خود آگے بڑھ کر کام کرتے تھے اور جو لوگ ان کے ساتھ آگے بڑھتے تھے ان سے محبت کرتے تھے۔ مایوسی کے حالات میں بھی مسکراتے رہتے تھے اور مشکلات کو کبھی سنسنی خیز بنا کر پیش نہ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جن دنوں اخوان شہدا کو پھانسی کی سزا ہوئی تو ان کا ایک بڑا دردناک خط میرے نام آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا جو بات ہم نظریات میں بیان کرتے ہیں وہ بات ان شہدا کے عمل میں آگئی ہے اور میں تو اپنی گردن کو ٹٹولنے لگا ہوں کہ یہ بھی اس عظیم آزمائش سے گزر جانے کی ہمت رکھتی ہے یا نہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جب مولانا محترم کے بارے میں حیدرآباد سندھ سے کسی اخبار نے خبر اڑادی کہ ان پر دل کے دورے کا حملہ ہوا تھا تو بنگال میں اس خبر نے ہمارے حواس اڑا دیئے تھے اور دو تین دن ہمارا بُرا حال رہا۔ انہوں نے اس دوران میں ایک خط لکھا کہ میری مخلصانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری عمر بھی اس مردِ مجاہد کو دے دے۔ آخر ہماری

زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ لیکن یہ شخص تو ایک نیا دور لارہا ہے۔ اس کی زندگی کی پوری انسانیت کو ضرورت ہے۔

چودھری صاحب کو قدرت نے بعض ایسی صلاحیتیں دی تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر کام کے اہل ثابت ہوتے تھے۔ خصوصاً جب کبھی کوئی بڑا کام تحریک کے سامنے آیا اور اس کی ذمّہ داری چودھری صاحب پر ڈالی گئی تو انھوں نے اس کا حق ادا کردیا اور ایسے مواقع پر اللہ نے بھی ان کی مدد فرمائی۔ منصب یا امتیازِ منصب کے وہ زیادہ قائل نہیں تھے۔ وہ صرف کام کے قائل تھے۔ وہ اپنے سارے ہی کام اپنے ہاتھ سے کرلیتے تھے۔ گھریلو ذمّہ داریوں سے اگرچہ بڑی کوفت ہوتی اور عموماً گھر کے کام سے بہت جی چراتے تھے لیکن جب آپڑے تو کرتے ہی تھے۔ وہ ایک مخلص رفیق اور وقت پر کام آنے والے دوست تھے اور ان کے دوست ان سے تقویت حاصل کرتے تھے۔ مختلف حالات میں وہ ہمیشہ ہمت افزائی کا باعث ہوتے تھے۔ ایک بار بنگال کے حالات پر مشتمل میں نے ایک مکتوب "چراغِ راہ" میں لکھا۔ اس میں اپنے مطالعے کے مطابق حالات بیان کئے گئے تھے۔ اور مہاجرین بنگال کے بارے میں بھی چند باتیں ایسی آگئی تھیں جو واقعات ہونے کے باوجود انہیں ناگوار ہوسکتی تھیں۔ اس پر مہاجرین کے بعض لیڈروں نے بڑا واویلہ کیا اور اخبارات میں کافی طوفان کھڑا کیا۔ پھر چودھری صاحب کے پاس آئے۔ چودھری صاحب نے کہا، تمہیں جس آدمی سے شکایت ہے وہ خود ذمّہ دار آدمی ہے۔ میں اس بارے میں کیا کرسکتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ اگر وہ محسوس کرے گا کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے تو ضرور معذرت کرے گا اور اگر سمجھے گا کہ معذرت کی ضرورت نہیں ہے، ٹھیک کیا گیا ہے۔ تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں تم جو چاہو جاکر کرلو۔" مجھے جب چودھری صاحب نے یہ بتایا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ کہ

چودھری صاحب نے بڑے تحمل اور بردباری بلکہ تدبیر کا ثبوت دیا تھا۔

معاملہ فہمی بھی ان میں بہت تھی۔ رفقاء کے چھوٹے چھوٹے لیکن پیچیدہ مسائل کو بڑی آسانی سے سلجھا دیتے تھے۔ البتہ جہاں معاملے کی خرابی یا عدل کے خلاف طرز عمل دیکھتے تھے۔ وہاں سختی کا رویّہ اختیار کرتے تھے۔

چودھری صاحب مدّت سے تحریک کے فارغ کارکن تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اس حیثیت میں وہ جماعت کے لئے ازحد مفید تھے لیکن ان کے دل میں بارہا یہ تمنّا آیا کرتی کہ وہ تحریک کا زیادہ سے زیادہ کام بلا معاوضہ کر سکتے۔ اس کے لئے ہم بارہا گفتگو کیا کرتے۔ میں خود اس سے مطمئن نہ تھا۔ ہم اکثر کوئی ایسا کاروبار جاری کرنے کے منصوبے سوچا کرتے جس کے ذریعے ہم قوتِ لا یموت کی حد تک معاش حاصل کر لیں تاکہ ہمارا بار اٹھ جائے اور ہم زیادہ سے زیادہ وقت تحریک کے کاموں کے لئے دے سکیں لیکن یہ تمنّا ہی رہی البتہ اگر کبھی وہ مجھے اس بارے میں ذرا بد دل محسوس کرتے تو پھر اس کی حمایت میں دلائل دیا کرتے " دیکھئے فارغ کارکن ہی تحریک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں جن کے بل پر سارا نظم و ضبط چلتا ہے۔ فارغ کارکنوں کو تنظیم میں سے نکال دیجئے اور پھر دیکھئے کہ پیچھے کیا رہ جاتا ہے" کبھی کہا کرتے " سب لوگ اپنے کاروبار میں وقت دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ بڑھا کر کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں۔ فارغ کارکن ایک بہت بڑا ایثار کر کے ادھر آتا ہے جو دنیا کے مادی مستقبل کی طرف سے لاپرواہ ہو کر تحریک کے لئے وقف ہو جاتا ہے" یہ سب دلائل تھے لیکن دل کی تمنّا ان کی بھی یہی تھی کہ اگر کسی طرح اتنا وقت دے کر اتنا کام جماعت پر کسی قسم کا بوجھ ڈالے بغیر کیا جا سکتا تو بہت اچھا تھا۔

چودھری صاحب کی زندگی ان زندگیوں میں سے ہے جو فنا ہونے کے بعد بھی زندگی سے محروم نہیں ہوتی۔ جنہوں نے اپنی مادی عمر میں اتنا کام کر لیا ہوتا ہے کہ زمانے کے سینے پر وہ خوبصورت نقش کی طرح کندہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی سمندر کے سینے پر اُٹھنے والے ان بلبلوں کی طرح نہیں ہوتی جو اُبھرتے ہیں، پھولتے ہیں، ثانیہ بھر اپنا روپ دکھاتے ہیں اور پھر مستقل فنا کی تہ میں جا بیٹھتے ہیں بلکہ ان کی زندگی اس چٹان کی طرح تھی جو تیز و تند حوادث کے دھاروں کے درمیان اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور زمانے کے سمندر میں تیرنے والے مسافر اس سے تقویت حاصل کرتے ہیں جن کی زندگی لحد کے کنارے پر پہنچ کر دم نہیں توڑتی بلکہ لحد کے دروازے سے گذر کر شاہراہِ حیات پر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ البتہ تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔"

چودھری صاحب آج ہم میں نہیں ہیں لیکن بار ہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ وہ ہمارے درمیان ہیں۔ ان کی کتنی ہی باتیں بار ہا یاد آتی ہیں اور ان کی باتوں سے ہم نے اپنے کاموں میں رہنمائی بھی حاصل کی ہے اور تقویت بھی پائی ہے۔ آج ان کا چہرہ ہم سے دُور اور غائب ہے لیکن ان کا کام ہمارے درمیان محسوس اور معروف صورت میں موجود ہے یہی وہ چیز ہے جو مومن کو مادی اسباب کی پابندی اور گرفت سے بالا کر کے آفاق گیر بناتی اور طلسم زمان و مکان سے ماورا کر دیتی ہے

جس تحریک کے وہ سپاہی تھے اس تحریک کو انسانی زندگی میں انقلاب و تغیر برپا کرنے کے بڑے بڑے کٹھن مراحل درپیش ہیں۔ ان مراحل میں جب مشکلات اور مصائب چاروں طرف سے بادلوں کی طرح گھر گھر کر آئیں گے تو مجھے یقین ہے کہ جہاں مالک الملک

کی رحمت سہارا دے گی۔ جہاں رحمۃ اللعالمین کے دامن کا سہارا بازو تھامے گا۔ جہاں ان انسانوں کی زندگیاں تقویت کا باعث ہوں گی۔ جن کی مثل سورج نے پھر کسی کو نہ دیکھا۔ وہاں چودھری صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے آئے گا اور کہے گا:

"بھائی صاحب، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ مالک تو اپنے غلاموں کو نوازنے کے لئے موقع کا متلاشی ہے"

آج جب ان سے ملاقات کو جی چاہتا ہے تو دل کہتا ہے کہ حشر سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے اور حشر خود بھی تو ایک حقیر مادی انسان کی محدود مادی زندگی سے زیادہ دُور نہیں ہے۔

(سوانح چوہدری علی احمد خان)

۱۹۵۶ء

اے راہِ حق میں نکلنے والو!

خدا کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے اپنی تجارتوں کے مندا پڑنے کی فکر سے بے نیاز ہوکر اپنے کاروبار کے نقصان سے بے پرواہ ہوکر. اپنے منافعوں، اور اپنے مالوں کی محبت کو ٹھکرا کر اس زمین کے سینے پر آوازِ حق کو پھیلانے کی تڑپ لے کر نکلنے والو! خدا تمہاری ان قربانیوں اور مساعی کو دامنِ قبولیت و رحمت میں سمیٹ لے۔

زمین کا سینہ تمہارے قدموں کی ٹھوکر سے مسرت پاتا ہے، اور آسمان کی جھیل تم پر اپنے تاروں کے موتی لٹانے کے لئے بے تاب ہے۔

تم جو اپنے سینوں کو کلماتِ حق سے بھرپور کر کے لئے جاتے ہو، اور سفری گٹھڑی کنبچے کندھوں پر لادے ہوئے ہو۔ کیا اس سے بے خبر ہو کہ ایک دل ہے جو تمہاری قسمت پر رشک سے دھڑکنیں کھو رہا ہے، اور ایک دماغ ہے جو اپنی محرومیٔ رفاقت سے غم آلود ہے۔ تم کیا

جانو کہ اسے تو تمہارے بستر کو باندھنے والی رسّی اور تمہارے جوتوں میں بندھے ہوئے تسموں پر بھی رشک آئے جا رہا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کاش اس کا وجود تمہاری اتنی سی خدمت ہی کر سکتا۔

راہِ حق میں کمریں باندھ کر نکلنے والے مسافرو ! تم ان دھڑکنوں کو نہ جان سکے۔ جو تمہارا ساتھ دینے سے محرومی پر ایک دل نے المناک ٹیسوں کی صورت میں محسوس کیں۔ تم اپنی دعوت کے نکات کو واضح تر کرنے کی سعی میں اتنے منہمک رہے کہ اس کرب کو پڑھ نہ سکے جو تمہارے پیچھے رہ جانے والے ایک غم نصیب ساتھی کے چہرے پر لکھا جا رہا تھا۔

تم مسرّت بھرے لمحوں میں باتیں کر رہے تھے اور ایک ذہن الم کے غبار سے اٹا جا رہا تھا، اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ تمہارے ایک ایک بستر اور ایک ایک بنڈل کو اپنے آپ پر لادے، اور اس بار کو اٹھا کر تمہارے ساتھ چل دے جو تم ساتھ لے جانے والے تھے۔

اسے گاڑی کے ایک ایک مسافر پر رشک آیا تھا جو تمہارا ہم سفر ہونے والا تھا، حالانکہ وہ بدقسمت تو اس بلند بختی سے ناواقف تھے جو ان کے کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے داخل ہو رہی تھی۔ اسے گاڑی کے ان تختوں پر، اس ڈبے پہ، ان پہیّوں پر بھی رشک آیا تھا جو تمہیں اپنے کندھوں پر اڑائے چلے جا رہے تھے۔ اس کا دل چاہا تھا کہ کاش وہ اس لائن کا ایک سلیپر ہی ہوتا، اور اس کے سینے پر سے تمہارا ڈبہ گزر جاتا، اور وہ پیچھے پڑا ہوا تمہاری محبوب منزل کی طرف حسرت سے تکا کرتا۔ اس کی آنکھوں نے دُور تک تمہارے ڈبے کی کھڑکی کا تعاقب کیا تھا، اور ہرگز نہیں چاہا تھا کہ وہ اس کی حدِ نظر

سے دُور ہو سکے۔

آخر تم اپنے طور پر مطمئن، اور ایک ذہن کو بے قرار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تمہارا پروگرام تھا کہ "نوشہرو فیروز" کے لوگوں سے جا کر کہو کہ

"اے لوگو! کیا تم اس حقیقت سے غافل ہو جو تم نے اور تمہارے ایمان نے چاہا تھا اور تم نے ہی کیا تمہاری ہستی کے مقصدِ وجود نے ہی چاہا تھا کہ اس ملک میں صرف حکم خدا کا چلے، اور قانون صرف شریعت کا ہو۔ لیکن یہ چپکے ہی چپکے کیا ہوا جا رہا تھا کہ اس ملک کی سیاست کا دھارا مدینے سے نیویارک اور لندن کی طرف موڑا جا رہا تھا۔ اقتدار پانے سے پہلے جن کی زبانیں اسلام اور قرآن سے تر رہتی تھیں۔ قوت پاکر انہوں نے بے دین سیاست اور فرنگی کے "قانون کو مرکزِ نگاہ بنا لیا تھا۔ اے لوگو! کیا تم نے یہ ملک اسی لئے حاصل کیا تھا کہ کفر کی خدمت کافروں کی بجائے مسلمان کریں۔ تم خوب جانتے ہو کہ تم نے تو اسے صرف اسلامی نظامِ زندگی کے لئے ہی حاصل کیا تھا"

پیچھے رہنے والے نے یوں محسوس کیا تھا جیسے تم جانے والوں نے اس کی قوتِ عمل کی نفی کی تھی، جیسے وہ ناکارہ اور بیکار تھا، جیسے وہ ان لوگوں میں سے تھا جو غزوہ کے وقت مدینے میں پیچھے رہ جایا کرتے تھے۔ یہ سوچ کر ایک ٹیس اس کے ذہن میں اس شدت کے ساتھ ابھر آئی تھی کہ اس کا دل بے اختیار تمہاری گاڑی کے پیچھے بھاگ آنے کو چاہا تھا، اس نے ماحول میں اپنے چاروں طرف دیکھا تھا کہ اس کے گرد صرف کاروبار میں الجھے ہوئے نفع و نقصان میں دبے ہوئے، دنیائے محض کے عشق میں مارے ہوئے ہوس آلود اور حسرت ناک چہرے رہ گئے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے گرد ایک دل بھی اس نیت سے نہ دھڑکتا تھا کہ اسے خدا کی راہ میں اپنی

چند دھڑکنیں وقف کرتی ہیں، اور ایک دماغ بھی اپنے دامن میں خدا خوفی اور خدا طلبی کا جوہر نہیں رکھتا تھا۔ اس ماحول میں اس نے اپنے آپ کو پاکر شدید تلخی محسوس کی تھی کہ اس کی ہستی کا رد نگٹا رونگٹا اپنی اس محرومی رفاقت پر ماتم کناں تھا۔ راہِ حق میں تمہارے تکلیفیں سہنے کے عزم کی قسم! تم نے کوئی قدم نہ اٹھایا ہوگا اور کوئی بات نہ کی ہوگی کہ اس کا دل تمہارے دلوں کی دھڑکنوں کا اور اس کا دماغ تمہارے ذہنوں کے خیالات کا ساتھی نہ رہا ہو۔

تمہارے قدموں پر پڑنے والی گرد کی قسم! اس کا ہیولائے تخیل اس وقت بھی تمہارے ساتھ تھا، جب تم نے اپنے قدموں چل کر "نوشہرو فیروز" میں ہونے والے اجتماع کا ڈھنڈورا پیٹا، اور اس وقت بھی تمہارے ساتھ تھا جب تم نے اپنے ہاتھوں سے ایک قصبے کی دیواروں پر ملک خدا کا، قانون شریعت کا، خلافت نیک بندوں کی، کے پوسٹر اور کتبے لگائے اس وقت بھی وہ تمہارے ساتھ تھا جب تم نے ناصرین اجتماع کو سردیوں کی بھیگی ہوئی شام میں نمازِ مغرب کے بعد خطاب کیا، اور اس وقت بھی ساتھ تھا جب تم نے حاضرین میں سے مختلف لوگوں کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس وقت بھی ساتھ تھا جب تم شہر کے مختلف معززین سے فرداً فرداً ملے۔ اور اس وقت بھی ساتھ تھا جب تم نے ادائے فرض کے بعد واپسی کے بستر باندھے۔ اپنی محرومی کے حسرت ناک لمحات میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ اس نے تمہارے خیال سے ہٹ کر گزارا ہو۔ کسی تانگے کے ہچکولے، اور کسی لاری کے فراٹے نہ تھے کہ اس کی ہستیٔ معنوی نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو۔

اے خدا کی راہ میں قدموں کو گرد آلود کرنے والے مسافرو! زمین کا سینہ تمہارے بوجھ کو باعثِ صد فخر۔ اور اس ملک کی وسعت تمہاری ہستی کو غنیمت جانتی ہے، ظلمت کے

اس گہرے دور میں پیغام حق کو لے کر اٹھنے والے ساتھیو! خدا تمہارے عزائم کو قوت و نصرت اور رحمت و شفقت کا تحفہ عطا کرے۔ اس ملک میں بہت کم دل، اور بہت کم سینے ہیں جو تمہاری کامیابی کی دعاؤں سے معمور نہ ہوں، اس ملک کا ذرّہ ذرّہ، اس ناشاد دنیا کا گوشہ گوشہ تمہاری طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، اور یہ ناشاد دل اس وقت کا شدت سے انتظار کر رہا ہے جب راہِ حق میں اس کی لاش تم سے دس قدم آگے گرے۔

(تصویر س)

۱۹۴۹ء

قافلۂ سخت جاں

ایک قافلۂ سخت جاں تاریخ کی شاہراہ پر مدت سے آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ لوگ اس کے منتظر ہیں۔ زمانہ خود اس کے لئے چشم براہ ہے۔ اس کے لئے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پرسوز تمنائیں ہیں۔ وہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔ کب منزل تک پہنچے گا کب اس کے برسائے ہوئے پھول زمانے پر بہار لائیں گے۔

وہ کب آئے گا جو اپنے ساتھ ایک حاکم کا حکم لائے گا اور سب حاکموں کو سرنگوں کردیگا جو اپنے ساتھ نبیوں کی سنت لائے گا۔ اور باقی کسی کی سنت نہ چلے گی۔ جو اپنے ساتھ الٰہی احکام لائے گا اور باقی سب کے احکام منسوخ قرار پائیں گے۔ آخر وہ کب آئے گا۔ جس کے لئے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ جس کا ذکر آنے پر آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے ہیں۔ جس کی آمد کا تصور پاکیزگی اور نیکی کا تصور ہے۔ جس کی آمد پر مغرب کو مشرق کی طرف سے ٹھنڈی

ہوا کے جھونکے سلام شوق دینے جائیں گے ؎

کونسی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے

عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

وہ جس کی آمد سے پہلے اس کے انتظار میں حضرت خباب بن ارت بھی بے تاب ہو گئے تھے جنہوں نے اپنی پیٹھ پر اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان پہلے ہی کندہ کر لئے تھے۔ یہ اس کے کتنے والہ و شیدا تھے۔ انہوں نے بے تاب ہو ہو کر اپنے آقا سے پوچھا تھا کہ میرے مالک وہ کب آئے گا۔ اب تو اس کی آمد کے انتظار میں آنکھیں ترس گئی ہیں اور سینے ویران ہونے لگے ہیں اور حضورؐ جو اس وقت حرم پاک کی دیوار سے سائے میں ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ اچانک سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ حضورؐ کے چہرے پر اضطراب تھا۔ حضورؐ کے الفاظ میں جوش تھا۔ حضورؐ کی آواز میں حوصلہ، ولولہ اور عزم تھا۔

"ارت کے بیٹے تم سے پہلے جن لوگوں نے اس کو لانے کا بیڑا اٹھایا۔ جانتے ہو ان کے ساتھ کیا کیا گذری۔ ان کے جسم آروں سے چیرے گئے۔ ان کو گہرے گڑھوں میں گاڑا گیا اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کی ہڈیوں سے گوشت جدا کر دیا گیا۔ اور پھر بھی وہ اپنے مالک کے وفادار بندے اس کی آمد کے لئے اپنے جسموں سے زمین ہموار کرتے رہے۔ تم صبر کرو اور اپنے مالک کے کام میں لگے رہو۔ وہ دن ضرور آئے گا جب ملک کے ایک گوشے سے ایک ضعیف عورت سونا اچھالتی ہوئی چلے گی اور دوسرے گوشے میں چلی جائے گی۔ اسے کسی کا خطرہ نہ ہوگا۔ اللہ کی زمین رحمت و امن سے معمور ہو جائے گی۔ بس صرف صبر کر کے اس کے کام میں لگے رہو اور اس کی راہ ہموار کرتے رہو۔"

برسوں سے جس کی آمد کا ہر کسی کو شوق تھا۔ اسلم۔ اکرم۔ طاہر آخر کون اس کے

شوق سے خالی تھا۔ کون اس کے قافلے کا حدی خواں نہ تھا۔ وہ کب آئے گا۔ کدھر سے آئے گا
بارہا سوچا تھا۔ پُرامید دل سوچتے تھے۔ مضطرب ذہن سوچتے تھے۔ آخر کون تھا جو اس
کی آمد کے ذوق سے محروم تھا۔ برسوں سے سڑک کوئی جارہی تھی۔ مدت سے سن رہے تھے
کہ وہ قافلہ سمت جاں روانہ ہو چکا تھا۔ سب لوگ زمانے کے افق پر نظریں جمائے کھڑے
تھے۔ سب اس کے نغمۂ جانفزا کے لئے گوشش برآواز تھے۔ سب یہ کہتے تھے ؎

ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں اے عشقِ خوش عناں

لیکن اُفق سنسان اور بے رونق تھا۔ فضا میں گردوغبار تھا اور شہسوار نظروں سے اوجھل
تھا۔ اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس کا روپہلی ننک، چہرہ نظر نہ آتا
تھا۔ ساتھی نوجوانوں کے عزائم ہم نے بارہا سنے تھے

" بنیادیں کھد رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان بنیادوں میں اپنی ہڈیاں بھر دیں۔ انہیں
بنیادوں پر وہ محل تعمیر ہوگا جس میں وہ شاہِ جہاں آکر قیام کرے گا" کوئی ایک گہرے عزم کا
اظہار کرتا۔

تحریک اٹھتی ہے تو ایک نسل اس کی جڑوں میں کھپتی ہے۔ دوسری نسل اس سے استفادہ
کرتی ہے" کوئی دوسرا اکر وعزیمت کا ثبوت دیتا۔

" ہمارا کام یہ ہے کہ ہم نظامِ اسلامی کی عمارت کی بنیادوں میں اینٹ، روڑے اور پتھر بن
کر سما جائیں۔ ہمارے بعد والے ہی اس کی تعمیر مکمل کریں گے" کوئی تیسرا اظہارِ خیال کرتا۔

یہ اظہارِ خیال ہوتا اور آنکھوں میں نمی تیرتی۔ انتظار کے آنسو آنکھوں کے پیمانوں میں چھلکتے
پُرتمنا دل دھڑکتے اور کتنی ہی زبانوں پر یہ سوال آجاتا کہ۔

" آخر اس دور میں نظامِ اسلامی کے قیام کی کتنی کچھ اُمید ہے۔ مولانا محترم آپ کی اس

بارے میں کیا رائے ہے"؟ یہ سوال بار بار ابھرتا، کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی دیس میں اور کبھی پردیس میں اور میرِ کارواں کی زبان پر ایک ہی جواب ہوتا"

"امکان دونوں طرح کا موجود ہے۔ پچاس فی صدی امید ہے کہ یہاں اسلام کا پرچم لہرائے اور دینِ حق کا بول بالا ہو اور پچاس فی صدی دوسری نوعیت کے امکانات بھی ہیں"۔

"ایسا نہ کہئیے۔ ایسا نہ سوچیے۔ ایسا نہ بتائیے"۔ کتنے ہی دلوں سے یہ آوازیں بلند ہوتیں لیکن حقیقت پسند راہنما حالات کا سینہ چیر کر دونوں قسم کے امکانات کا ثبوت نکال کر سامنے رکھ دیتا: "بات یہ ہے کہ یہ ملک صرف اسلام ہی کے لئے بنوایا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں ان لوگوں نے بھی حصہ لیا جن کو پختہ یقین تھا کہ وہ کبھی اس میں آباد نہ ہوں گے۔ اس کے لئے برِصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں نے اتنی عظیم قربانیاں گن گن کر نقد ادا کی ہیں کہ جتنی قربانی کبھی کوئی شخص اپنے مادی فوائد یا دنیوی اغراض کی خاطر نہیں دیا کرتا اور قوم کا اجتماعی ضمیر اب بھی اسلام کا منتظر ہے۔ اور بدعملی کے باوجود خدا اور اس کے رسولؐ کا وفادار ہے اور اس ملک میں ایک تحریک اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے چل رہی ہے۔ یہ حالات اسلام کی آمد کے لئے پچاس فی صدی امکان کا باعث ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ حکمران طبقہ اپنی پوری قوت اسلام کے خلاف استعمال کر رہا ہے اور اس نے ملک کے سارے ذرائع اسلام کی مزاحمت اور قوم کا ذوق اسلام بدل ڈالنے کے لئے جھونک رکھے ہیں۔ اوپر کا طبقہ تمام تر اسلام سے بگڑا ہوا اور منحرف ہے اور قوم کو خود اسلام کی شناخت نہیں ہے۔ چنانچہ غیر اسلام کے مقابلے میں قوم کی مزاحمت دن بدن کمزور پڑ رہی ہے۔ یہ دوسرے قسم کے امکانات ہیں جو موجود ہیں۔ البتہ اس ترازو کی ڈنڈی اس باشعور اسلام پسند متوسط طبقہ کے ہاتھ میں ہے، جو اگر اپنا سارا وزن اور قوت اور محنت اور ذرائع صرف کرے۔ اور فیصلہ کن اقدام اسلام کے حق میں کرے۔ تو اسلام کے لئے میدان

جیتا جا سکتا ہے:

"انشاء اللہ یہ میدان جیتا جائے گا۔ یہ بازی جیتی جائے گی۔ مسلمان قوم کا متوسط طبقہ اپنے ضمیر کو جگاتا ہوا آگے بڑھے گا۔ اور اسلام کے لئے اپنا پسینہ بہا کر، اپنا خون دے کر، اپنا آپ لٹا کر اور مٹا کر زمین ہموار کرے گا۔ یہ قافلہ سخت جان اپنی منزل پر پہنچ کر رہے گا" یہ آواز ہر منتظر دل سے ابھرتی ہے۔

"لیکن کب۔ کدھر سے۔ یہ ظلمت کب دُور ہوگی" افقِ انتظار پر سوال ابھرتے ہیں۔ جواب ملتا ہے کہ جب بندۂ حق میدانِ زندگی میں کلمۃ الحق کی خاطر جہاد کی صعوبتوں اور آزمائشوں سے سرخرو ہو گزرے گا۔ لیکن پھر سوال یہ ہے کہ جہاد کیا ہے؟

اگر جہاد کی علامات میں یہ چیزیں شامل ہیں کہ انسان معرکۂ جہاد میں شدید محنت اور مشقت سے دوچار ہو تو میں بلا شبہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے عزیز ساتھیوں اور دوستوں نے دنوں کو بھی اس حال میں کام کیا ہے کہ جب دوسرے لوگ اپنے کاروبار کو چمکانے کی فکر میں مصروف ہوتے۔ اس حال میں بھی کام کیا ہے کہ جب دوسرے لوگ قیلولے فرما رہے ہوتے۔ اس حالت میں بھی کام کیا ہے کہ شدتِ گرمی سے پسینہ سر سے پاؤں تک ٹپک رہا ہوتا۔

اگر جہاد کی علامت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ انسان راتوں کو جاگے اور پہرے دے اور محنت کرے۔ اور اس جاگنے کو کسی زاہد کی ہزار شبوں کی عبادت پہ ترجیح دی گئی ہے۔ تو پھر میں بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے محترم ساتھیوں اور رفیقوں نے راتوں کو بھی اس طرح کام کیا ہے کہ رات کے بارہ بجے سے ۳ بجے اور بعض اوقات ۴ بجے تک جاگ جاگ کر حق کو بلند کرنے کے لئے مشقتیں برداشت کی ہیں۔ اور تبلیغ و اشاعتِ دین کا فریضہ ادا کیا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں اور بعض بعض حالات میں سُوج سُوج گئی ہیں۔ لیکن کام

کرنے والوں نے اپنے آپ کو کام کا اسی طرح پابند رکھا اور محسوس کیا ہے جیسے کوئی شخص
مورچے پر پابند اور مستعد ہوتا ہے۔

اگر جہاد کی علامات میں یہ علامت بھی شامل ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں جد وجہد کرتا ہوا
بھوکا پیاسا بھی رہے۔ اور آسائش کی سہولتوں سے بے نیاز ہو جائے۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں
کو اس حال میں بھی دیکھا ہے۔ کہ بھوک سے بُرا حال ہے لیکن کام کر رہے ہیں۔ خود ہی کھانا پکانا
یا تیار کروانا ہے۔ اور خود ہی باہمی کھانا کھلانا ہے۔ فرشِ زمین کے بچھونے ہیں۔ اور بازوؤں کے
تکئے ہیں۔ دن کو روزے رکھنا اور روزے کی حالت میں دورے اور ملاقاتیں کرنا۔ کام کرنا اور پروگرام
بنانا۔ نہ لباس کی فکر نہ آرام کی طلب اور نہ کسی سہولت کا مطالبہ۔

اگر جہاد کی علامت یہ بھی ہے کہ انسان مورچے پر بھوکا رہے۔ تو پھر کئی کئی ساتھی صبح
سے شام تک بے کھائے پئے ہی کام کرتے رہے ہیں۔ تاکہ کھانے پینے کے سبب کام میں
رکاوٹ نہ پڑے۔ اور تو اور عورتوں تک نے شب و روز ایک کئے ہیں اور لباس و خوراک
ہر طرف سے بے نیاز ہو کر خالص میدانِ جہاد کے سے ایسے دن گذارے ہیں کہ انہیں
اپنے گھر کے دروازے تک بھول گئے۔ اور ساری توجہ اور جد وجہد صرف تبلیغ اور نشر و اشاعت
دین کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر جب عشقِ خوش عناں کو اپنی ساری کائنات
ہی یہ کہہ کر پیش کر دی جائے۔ ع

یہ دل ہے۔ یہ دماغ ہے یہ جسم ہے یہ جاں

تو پھر معرکۂ حق و باطل میں کوئی کس طرح ایک کونے میں دبک کر بیٹھ سکتا ہے۔
رمضان کا مہینہ تھا۔ فصلیں پکی ہوئی تھیں۔ کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ گرمی
بے پناہ تھی۔ دور کا سفر تھا۔ لیکن معرکے میں شرکت کے لئے کہاں کہاں سے لوگ

جمع نہیں ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ سب کو یقین تھا کہ یہ قافلہ آگے بڑھے گا۔ یہ پیام زندگی لانے والا نرم رو قاصد ہر کہیں جائے گا۔ بستیوں میں پہنچے گا۔ گاؤں میں جائے گا۔ ہر ہر قدم پر لوگ اس کے استقبال کے لئے اٹھیں گے۔ اس پر پھول نچھاور کریں گے اس سے امیدیں یا ندھیں گے اور کہیں گے۔

- تم نے ہمیں کتنا انتظار کرایا۔ کتنے ہی لوگ انتظار کرتے کرتے تھک کر زندگی سے گزر گئے۔ اے زندگی کے نرم رَو قاصد تم نے آتے آتے برسوں لگا دیئے۔ ہم نے تیرے لئے جان و مال، عزت و آبرو کی بازی لگائی تھی۔ ہماری قربانیاں لوگوں نے اغراض پرستی کے کباڑ خانے میں ردی کے بھاؤ بیچ دیں۔ اور تم نہ آئے۔ اے اس گھر کے مالک آؤ۔

اور کوئی مانے نہ مانے میرا وجدان کہتا ہے کہ وہ جس نے اپنے رُوئے زیبا کی ہلکی سی جھلک ایک بار دکھائی ہے۔ وہ محبوب آنے والے آیام میں پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آئے گا۔ جس کے دیدار سے دکھوں کے ماروں کی تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ وہ مرکب ایام پر دندناتا ہوا آئے گا اور اس کی آمد سے زندگی کے خشک سوتے پھوٹ بہیں گے زمین اپنا سونا اگل دے گی اور آسمان اپنی رحمتیں اس کے لئے انڈیل دے گا۔ منزلوں دور تک اس کو رعب و وقار کے ذریعے مدد دی جائے گی۔ اور وہ گرتے ہوؤں کو اٹھاتا ہوا اور مغروروں کا سر نیچا کرتا ہوا ضرور آئے گا۔

شوق کہتا ہے کہ مجھے اس کا نشان بتاؤ۔ میں جاکر اس کے قدم چوموں۔ اضطراب کہتا ہے مجھے تھامو۔ میں اس کے قدموں کی دھمک محسوس کر رہا ہوں۔ دل کہتا ہے۔ وہ چلا آرہا ہے۔ وہ بڑھا آرہا ہے۔ وہ بادِ صبا کے دوش پر سوار وہ زمانے کو ہواؤں کی لگامیں دیئے وہ بجلی کے چابک لہراتا وہ بادلوں کے چتر تانے وہ دھرتی کے سینے پر صلح دامن

کے غنچے کھلاتا بڑھا چلا آرہا ہے۔ تمہاری آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ تو اپنی بینائی کا ماتم کرو۔ تمہارے کان اس کی سماعت نہیں کر سکتے تو اپنی سماعت کا روتا رو لو۔ تمہاری مشامِ جان اگر اس کی آمد کی خوشبو سونگھ نہیں سکتی تو یعقوبؑ کا سا سوزِ دروں پیدا کرو لیکن میں تو صاف دیکھ رہا ہوں۔ سن رہا ہوں۔ سونگھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ وہ زمانے کا شہسوار بڑھا چلا آرہا ہے۔ اور اس کے جلو میں زندگی کے قافلے اس کی رکاب تھامے رواں دواں ہیں۔

(انتظار)

۱۹۵۸ء

ہمہ پہلو تعمیرِ کردار

رفیقِ عزیز! مالک الملک کی رحمت و سلامتی تمہیں اپنی پناہ میں رکھے۔

ایک مدت کے بعد تم نے اپنے حالات و کوائف سے آگاہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس جہان کی پہنائی میں تم کھو گئے تھے۔ کتنے ہی احباب کی یادیں ماضی کے وسیع دھندلکے میں مصری عجائب خانے کی ممیوں کی طرح پڑی تھیں۔ بے حس و حرکت، منجمد اور بے روح کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ ان تمام قدیم یادوں پر پھپھوندی سی لگ گئی ہے۔ ماضی کے وسیع نشیب و فراز میں کتنے ہی احباب ہیں جنہوں نے حافظہ کے وسیع میدان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ان کو آواز دیں تو انہیں سنائی نہیں دیتی۔ انہیں بلائیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ کی دھندلی شاہراہ پر گزرے ہوئے راہ گیر کے نقوشِ قدم میں جو ایام کی گرد کے نیچے مدھم پڑتے جا رہے ہیں۔ تم بھی انہیں مدھم نشانات میں سے ایک

نشان بن کر رہ گئے تھے۔ تم نے جو یاد کیا تو محسوس ہوا ہے کہ گویا میاں بھی گفتگو کیا کرتی ہیں۔ اور ماضی میں سے بھی چھن چھنا کر آوازیں حال میں داخل ہو جایا کرتی ہیں۔ تم نے یہ کیا لکھ دیا کہ میرے لئے دعا کرو۔ نماز سے رغبت کم ہو گئی ہے۔ دعوتِ دین سے نظری اتفاق ہے لیکن عملی طور پر شل ہو گیا ہوں۔ شاید شیطان کا قابو چل گیا ہے۔ مقصدِ زندگی سے دھیا دھیا سا لگاؤ ہے لیکن ساتھ چلنے سے جی چراتا اور کتراتا ہوں۔ صحت بہتر ہے لیکن طبیعت بے چین رہتی ہے۔ بتاؤ کیا کروں۔ کیا پڑھوں"؟

عزیز دوست! تمہاری اس بات نے کتنے ہی گھاؤ تازہ کر دیئے ہیں۔ کتنی ہی مجروح یادوں نے دل و دماغ میں ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ دل میں کتنے ہی بھیانک خلا بعض قدیم احباب نے بنا دیئے تھے۔ جن میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ بعض اوقات کسی عزیز کی مقصدِ زندگی کے ایسے انجام سے اس کی موت زیادہ خوشگوار محسوس ہونے لگتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ محاذِ جنگ سے مفرور ہونے سے پہلے وہ محاذِ جنگ پر کام آگیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ مجھے شدت سے کام لینے کا طعنہ نہ دینا۔ میرے نزدیک دینِ حق کی سربلندی کا جھنڈا اٹھانے کے بعد اسے پھینک دینا بیٹھ جانا اور پیٹھ دکھانا موت سے بدتر انجام ہے۔ ایسا خوفناک خط تم مجھے نہ لکھتے تو شاید میں تمہاری طرف سے مطمئن رہتا اور سمجھتا کہ زندگی کے کارزار میں تم کسی نہ کسی محاذ پر ضرور مردانہ وار باطل کے خلاف جو کھکی لڑائی لڑ رہے ہو گے۔ لیکن تمہاری ان سطور نے تو کتنے ہی زخموں کے ٹانکے توڑ دیئے ہیں۔ تم نے خط میں کاروباری کاموں کی کثرت اور معاشی جدوجہد کی مصروفیات کا رونا بھی بہت رویا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ عزیمتِ اسلام کے اس پُرمصائب دور میں اسلام کے غریب خادموں میں سے ایک خادم کو جیسے خوشحالی نے ڈس لیا ہے۔ دعا تو میں ضرور کرتا ہوں۔ باطل کے خلاف حمایتِ حق

ہیں لڑنے والے ہر ساتھی کے لئے دعائیں کیا کرتا ہوں لیکن دعا وہی کارگر ہوتی ہے۔ جو انسان خود اپنے مالک سے قریب تر ہو کر اسے دردمندی سے پکار کر اس کے سامنے اپنی ساری مجبوریاں۔ معذوریاں۔ کمزوریاں اور کوتاہیاں رکھ کر مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے بڑی دعا اور کیا ہو سکتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ بندہ مدد مانگنے سے پہلے اپنی بندگی کو خالص کر کے اپنے مالک کے سامنے اسے عاجزانہ ہدیہ کے طور پر پیش کر سکے۔ مادہ پرستی کی دوڑ میں مصروفیات کی سب سے پہلی چوٹ نماز پر ہی پڑتی ہے جو مالک سے قربت کی ڈیوڑھی ہے اور اس کے سامنے عاجزانہ حاضری میں مدد طلبی کی واحد صورت ہے۔ پھر نماز میں فرائض تو اس کا حکم ہے۔ البتہ مالک کے حکم کے علاوہ مزید اس کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے سے جو اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ نوافل ہیں جن سے پتہ چلے کہ بندہ اس در سے کچھ مزید کا طالب ہے اور خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ ہو سکے تو الارم لگا کر رات کے پچھلے پہر اٹھو۔ چند دن ہی سہی ڈیوٹی سمجھ کر ہی سہی۔ چاہے اپنے آپ پر جبر کر کے! یہ سمجھو کہ حاکم سے ایک خاص کام پڑ گیا ہے اور اس کے دربار میں آسانی سے باریابی کے لئے وہی وقت مقرر ہے۔ چھپ چھپ کر جب اس کے سامنے اظہار بندگی کیا جائے اور صرف اسی کو مخاطب اور متوجہ کر کے کیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے کہ حاکم اعلیٰ تک اپروچ کا بندے نے ایک راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ تب دعا میں تاثیر بڑھ جاتی ہے اور اخلاص کا ثبوت ملتے ہی دعا بجلی کی سی سرعت سے آدمی کی ہستی سے اٹھ کر افلاک کی پہنائیوں میں سرایت کر جاتی ہے تو بھائی میرے اگر مصروفیت نے پکڑ لیا ہے تو اس وقت مالک کے پاس عرضداشت لے کر پہنچو۔ جب تمہارے شہر میں کوئی دکان کھلی نہیں ہوتی اور کوئی کاروبار

الجھانے کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ اگر عزت نہ ہو تو ابتداءً یہ کام جبر سے ہی کرو۔ دراصل بات تو خود تمہارا دل ہے۔ اگر اسے سومنات کے مندر کی طرح بند رکھوگے تو پھر اسے دوسرے کی دعائیں کیسے کھولیں گی۔ دوسرے تو زیادہ سے زیادہ اخلاص کی ہی دعا کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی تب اثر کرتی ہے جب پودا زمین میں جڑ پکڑ چکا ہو۔ اگر جڑ ہی اکھڑ چکی ہو تو باہر کا پانی کوئی سرسبزی پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک کام اور کرو۔ تمہارے محلے میں ایک ہسپتال ہے۔ کبھی کبھی وقت نکال کر ہسپتال کے جنرل وارڈ میں مریضوں کی مزاج پرسی کے لئے چلے جایا کرو۔ بیمار ناتواں مجروح زندگی سے بیزار اور پریشان حال نحیف و نزار انسانوں سے جا کر ملو۔ ان کے حالات معلوم کرو۔ ان کے دکھ درد کا جائزہ لو۔ ان کے غم و اندوہ اور رنج و الم کو دیکھو۔ ان سے تعارف حاصل کرو۔ روزانہ کم از کم تین مریضوں کی مزاج پرسی کر آیا کرو۔ اسے چند دنوں کے لئے معمول بناؤ۔ اور یہ سمجھ کر کہ مالک اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ دوسرے مصیبت زدہ بندوں سے ہمدردی کرے۔ اگر کبھی کسی مریض کو حقیقی حاجت مند پاؤ تو ہمت کر کے اس کی مدد بھی کر ڈالو لیکن کراہت سے نہیں، خوش دلی سے بس کبھی کبھی یہ محسوس کرنے کی کوشش بھی کرنا کہ ان کی بجائے اگر تم خود ہوتے تو تمہارا کیا حال ہوتا۔ تم کتنے دوسروں کی ہمدردی کے محتاج ہوتے تم کتنے دوسروں کے ہمدردانہ الفاظ تک کے منتظر ہوتے۔ بس یہ سوچ کر خدا کے ان نحیف و نزار بندوں کی عیادت ضرور کر آیا کرو۔ اس کام کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا کام کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ ہو سکے تو کبھی کبھار محلے کے قبرستان میں بھی جا کر ہو آیا کرو۔ وہاں بڑے بڑے کاروباری اپنا کاروبار حیات سمیٹ کر پڑے ہیں۔ ان کے مکانات تمہارے اپنے محلے میں ہیں۔ جن کے گرنے یا کھڑے رہنے کی طرف سے وہ ایسے بے نیاز ہیں۔ جیسے

انہوں نے یہ کبھی بنائے ہی نہ تھے۔ ان کے کاروبار تمہاری بستی میں اب بھی چل رہے ہیں۔ لیکن جن کا گمان تھا کہ ان کے بغیر کاروبار نہ چلیں گے۔ کاروبار چل رہے ہیں لیکن وہ کاروبار کے ساتھ نہ چل سکے جنہیں لمحہ بھر فرصت نہ ملتی تھی۔ اب انہیں تا قیامت فرصت ہی فرصت ہے۔ کاروبار سے بھی اور عمل سے بھی اس لئے کہ دنیا کی امتحان گاہ میں ہی تو مقابلہ تھا کہ کاروبارِ دنیا کے اندر رہ کر عمل کیسے کیا جائے اور عمل کرتے ہوئے کاروبارِ دنیا کو کیسے نبھایا جائے۔ دونوں میں سے محض کوئی ایک شے مطلوب نہ تھی اگر ہوتی تو امتحان ہی کیوں ہوتا۔ امتحان تو تھا ہی اس مقابلے اور توازن میں۔ اس لئے چند دن اس شہرِ خموشاں کا علی الصبح یا سرِ شام دورہ کرو۔ ان کی قبروں کا حال دیکھو۔ ان کے کتبے پڑھو۔ ان سے علیک سلیک کرو۔ اور آخرت کی عدالت لگنے تک عدالت کے احاطے میں ان کے صدیوں کے انتظار کا حال دیکھو۔ غور کرو کہ اس قطار میں کھڑے ہونے کے لئے ہم تم بھی خلقِ خدا کے اس جمِ غفیر میں قبرستان کی طرف رواں دواں چلے جا رہے ہیں۔ فی الحال یہ تین کام کرو اور یہ حمیت و غیرت بھی اپنے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کرو کہ دشمنِ حق نے آخر تمہی کو نرم چارہ سمجھ کر کیوں مقصدِ حیات سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ پھر وہ اتنا جری کیوں ہو گیا ہے کہ علی الاعلان تمہیں احساسِ شکست دلا رہا ہے کہ میں نے تم پر قابو پا لیا ہے۔ یہ تو بڑی شرم کی بات ہے۔ بلکہ یہ بات حمیتِ مومن کے خلاف اور اس کی مردانگی کو کھلا کھلا چیلنج ہے۔ اس نے اگر یہ تمہیں احساس دلایا ہے کہ وہ تم پر قابو پا گیا ہے تو تم بھی اسے خم ٹھونک کر جواب دو کہ بندۂ مومن کو مفتوح کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ فرعون و نمرود بھی جس مومن کی سطوت سے پناہ مانگیں اس پر چند اندیشہ ہائے دور دراز کا جال پھیلا کر قابو پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پڑھے

کے لئے قرآن میں قیامت اور احوالِ آخرت کے مقامات حدیث میں کتاب الرقاق کا حصہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سیرتوں سے زیادہ موزوں چیز اور کوئی نہیں جنہوں نے یہ کام پہلے احسن طریقے پر کیا ہے۔ بس ان کی درخشاں زندگیاں ہی تھکے ہوئے راہیوں کے لئے نشانِ منزل کا کام دے سکتی ہیں ہو سکے تو قرآن کے تیسویں پارے میں قیامت کا حال بتانے اور لرزا دینے والی سُورتیں پڑھو۔ خلفائے راشدین کے احوال پڑھو یہ سمجھ کر پڑھو کہ اصل وہ تھے اور ہمیں انہیں کی نقل مطابق اصل کرنی ہے کاروبار انہوں نے بھی کئے تھے لیکن ترازو کے ایک پلڑے میں سامانِ دُنیا ہوتا تو دوسرے میں خوفِ خدا۔ پیمانے کے ایک سرے پر کپڑا ناپا جاتا تو دوسرے سرے پر قبر کا کنارا نظر آتا۔ ایک طرف ملکوں کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوتیں تو دوسری طرف داڑھی ہاتھ میں پکڑے رات کو رو رہے ہوتے کہ" اے دنیا دُور ہو جا مجھے فریب نہ دے۔ میں تجھے طلاق دے چکا۔ یہی تو وہ لوگ تھے جو زمین کا نمک تھے جن کی مثل گروہ تختہ زمین پر کبھی وارد نہ ہوا۔ ہمیں تو انہی کے نقشِ قدم کی تلاش ہے۔ وہ نقش قدم مل جائے۔ تو عزیز دوست زندگی سونے کی کان سے زیادہ قیمتی اور ہر سانس جواہرات سے زیادہ بیش بہا ہو جائے اور تم خوب جانتے ہو کہ وہ جس پارس سے چھو کر سونا بنے تھے۔ وہ خود فریضہ اقامت دین کے لئے اٹھنے سے پہلے اپنے دیس کا ملک التجار تھا لیکن جب اپنے مالک سے زندگی کا سودا کیا تو روپیہ کمانے والے کاروبار سے دامن جھاڑ کر اٹھ گیا۔ اور روپیہ بناتے بناتے انسان سازی کا کام شروع کر دیا تم خود جانتے ہو کہ اس کے بنائے ہوئے انسان دنیا میں بے مثل انسان ثابت ہوئے اور دنیا کا بہترین گروہ کہلائے۔ دائیں ہاتھ سے نوالا اٹھانے کی سنت تو آج ہر مسلمان کو یاد رہ گئی ہے لیکن شائد یہ سنت یاد نہیں

رہی کہ سرورِ عالم نے مالک کی راہ میں اپنی زندگی کا سارا سونا لگا دیا تھا اور اپنے پاس کھجور کے بوریئے کے سوا باقی کچھ نہیں رکھا تھا۔ دینِ حق سے دل و دماغ کا اتفاق اور دست و بازو کا فالج تو بہت بڑی بیماری ہے جس کا تم نے اپنے بارے میں ذکر کیا ہے۔ اسی نفاق نے ہماری ساری قومی زندگی کو بے جان بنا کر رکھ دیا ہے اور پوری ملت بھوسے کا ڈھیر بن گئی ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے۔ ڈانڈا ہاتھ میں لئے اس پر سوار ہو جاتا ہے اور یہ اپنے قیمتی اصولوں پر نظری ایمان رکھتے ہوئے عملی طور پر ہر ہنٹر باز کے اشارے پر چلتی ہے اور بالعموم پشت بمنزل ہی چلتی ہے۔

تم بہت مایوس نظر آتے ہو۔ کہتے ہو مدتیں بیت گئیں لیکن اسلامی نظام نہیں آیا۔ تمہاری یہ مایوسی بھی دراصل اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تم نے چشمۂ بیم و رجا سے رشتہ کمزور کر لیا ہے۔ جس راہ پر چلنے کا دعوے تم لے کر چلے تھے وہاں حساب کتاب نہیں کیا جاتا کہ کب چلے اور کتنا چلے اور کہاں تک پہنچے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس راستے پر جانا ہے وہ راستہ موجود ہے اور اس کی دی ہوئی ٹانگیں بھی موجود ہیں۔ وہ نہ رہیں گی تو گھٹنوں کے بل چلیں گے۔ پیٹ کے بل گھسٹیں گے۔ اس سے بھی گزر گئے تو آنکھیں تو نشانِ منزل کو دیکھنے کے لئے موجود ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہ لوٹیں گے۔ کسی صوفی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس ؎
دو نیناں مت کھائیو مجھے پیا ملن کی آس

بھائی میرے! یہ تو سوچو کہ جس راہ پر چلنے کا عزم رکھتے ہو۔ اس راہ پر ایسے ایسے راہرو گزر چکے ہیں جنہوں نے اگر نو سو سال تک دعوتِ دین کا کام بے ثمر کیا ہے تو بھی مایوس نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ زمین کے مالک نے جیسی زمین دی تھی۔ مزارع نے

اسی کے اندر ہل چلانا تھا۔ ہمارا کام اس کی زمین میں ہل چلاتے رہنا ہے۔ شور زمین میں کچھ پیداوار نہ ہوئی تو مالک خوب جانتا ہے کہ اس کے نوکر نے محنت کی ہے یا نہیں اور فصل نہیں ہوئی تو اس میں کسان کی محنت کا قصور ہے یا زمین کے شور کا۔ تم نے خدا کے اس نیک بندے کا نام تو سنا ہی ہے جنہیں حضرت ایوبؑ کہتے ہیں۔ برسوں تک بیماری میں مبتلا رہنے اور بدترین تکلیف دہ حالات گزارنے کے بعد جب انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے مالک سے اپنی بیماری اور تکلیف کے لیئے دعا کریں تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے اپنے مالک سے شرم آتی ہے جس نے عمر بھر خوش و خرم رکھا۔ اب ابتلاء کے چند ایام پر ہی بے صبر ہو کر میں اس کے احسانات کیسے بھول جاؤں۔ مالک خوب جانتا ہے کہ اس کا بندہ کس حال میں ہے اور وہ اپنے بندے کے لیئے کافی ہے۔ مالک کا شکر کرو۔ اس نے کامیابی کو اجر کا مدار قرار نہیں دیا بلکہ اجر کی ابتداء نیت سے کی اور مومن کی دلِ شکستگی پر اسے دہرے اجر کی خوشخبری سنائی۔ تم ویٹ نام والوں کو دیکھو جو اپنے خدا سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتے لیکن محض زمین کے ٹیلوں باغوں کھیتوں کارخانوں اور جنگلوں تک کے لیئے پیہم لڑنے اور ہزار سال تک نسل در نسل لڑنے کا داعیہ رکھتے ہیں اگر نفس کا بندہ انسان درختوں ٹیلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے لیئے صدیوں تک لڑنے کا داعیہ رکھ سکتا ہے تو خدا کا بندہ مومن اپنے مالک کے لیئے باطل کے خلاف زندگی بھر لڑنے اور کبھی نہ جھکنے کا عزم کیوں نہیں رکھ سکتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کفر کے حصے میں سونا اور اسلام کے حصے میں مٹی آئی ہے اگر تم یہ کہو تو یہ احساسِ کمتری کا مظاہرہ کروگے میں تو یہ بات کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مومن کو اپنی پوشیدہ قوتوں کا شعور نہیں ہے۔ جس روز وہ جاگے گا دنیا کے اندھیرے روپوش ہو جائیں گے

ذاتی تربیت اور اصلاحِ فرد کے بارے میں بھی تمہارے خیالات میں الجھاؤ پیدا ہوگیا ہے
تم سمجھتے ہو کہ سیاسی الجھاؤ سے ہٹ کر یکسوئی کے ساتھ اپنی اور عوام الناس کی تربیت کی
جائے۔ پھر مثال دیتے ہو کہ ہمارے تربیت کردہ لوگوں کے مقابلے میں فلاں فلاں طریقے
پر تربیت یافتہ لوگ تقوے اور پرہیزگاری کے معروف پیمانہ سے زیادہ مطابقت رکھتے
ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم کس طرح پلٹ کر پھر گزرے ہوئے راستوں میں بھٹک رہے ہو۔
تحریکِ اسلامی کے نزدیک ذاتی تربیت اور اصلاحِ فرد کا وہی طریقہ بہترین اور فطری ہے
جو نے اپنے ساتھیوں کے لئے استعمال فرمایا تھا جو بھی آگے بڑھا اس کے اعتقاد و ایمان
کی بنیادیں درست کر کے اسے بھی دعوتِ دین کے اسی کام میں لگا دیا گیا جس میں
حضورؐ خود معروف تھے یعنی نظامِ باطل سے کشمکش، یہ کام ہی خود ایسی بھٹی ہے جو سونے
کو کندن اور کندن کو پارس بنا دیتی ہے اور جو مال کھوٹا ہو اسے کاٹ کر الگ پھینک دیتی
ہے۔ اس تربیت کے لئے علیحدہ کسی خانقاہ کی تعمیر اور اس کے نظام الاوقات مرتب کرنے
کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ نہ کسی چلہ کشی کی حاجت ہوتی ہے جیسے صحابہ کرام کو اس
کی ضرورت نہ پڑی تھی خانقاہی طریقہ کو نہایت خلوصِ نیت کے ساتھ ہی سہی اس وقت
مرتب ہوا جب ملوکیت نے مذہب کو سیاست بدر کر دیا۔ اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک بہت
بڑا حصّہ مذہب سے آزاد ہو کر مذہب سے آزاد سیاست کے چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ
ایسی تنگ صورتِ حال میں جو نظام تربیت بنے گا وہ ایک طرف انسانی زندگی کے بہت
وسیع سیاسی دائرے کو چھوڑ کر بنایا جائے گا اور دوسری طرف انسانی زندگی کے لئے دیئے
ہوئے اسلام کے وسیع ترین احکامات معطل ہو کر جب صرف عبادت اور اوراد و اشغال
تک ہی محدود ہو جائیں گے تو اسی محدود دائرے میں انہماک و اشتغال بھی بڑھ جائیگا۔

بلاشبہ اس سے معروف رواجی متقیوں جیسی ہیئت ابھر آتی ہے۔ اس لئے کہ اس مذہبی ہیئت کی تیاری مذہب بلا سیاست کے طریقے سے ہی ہوتی ہے لیکن تربیت ہمہ پہلو اور ہمہ گیر نہ ہونے کے سبب زندگی دورنگی سہ رنگی بلکہ پچرنگی تک ہوجاتی ہے اور عبادت و اوراد اور معروف شرعی ہیئت کے ساتھ معاملات کی خرابی، کردار کی کمزوری بلکہ لوگ منکرات تک میں مبتلا رہتے ہیں اور کوئی انقباض یا تضاد محسوس نہیں کرتے۔ چونکہ تربیت کا سانچہ ہمہ گیر نہیں بلکہ چند پہلو گیر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے ایک معمار پوری عمارت بنانا جانتا ہو۔ چاہے معمار نہایت اعلیٰ نہ ہو اور دوسرا معمار صرف غسل خانہ ہی بنا سکتا ہو اور معیار نہایت اعلیٰ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کو تو پورے مکان کی ضرورت ہے ایک غسل خانے میں تو ساری زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ غسل خانے میں خواہ غسل و طہارت کے تمام شرعی آداب کا لحاظ رکھا گیا ہو لیکن اس سے باہر تو زندگی نہ معلوم کن کن آلودگیوں میں ملوث ہوتی رہے گی گویا نظام باطل کے خلاف کشمکش سے ہی خالص ہمہ پہلو اسلامی کردار تعمیر ہوتا ہے۔ اس کشمکش سے علیحدہ کردار مکمل نہیں ادھورا بنتا ہے۔ اسلام نے اگر فرد کی اصلاح کا کوئی نظام تربیت مرتب کیا تھا تو اپنے غلبے کے لئے کیا تھا نہ کہ باطل کے غلبہ کو قائم رکھنے اور اسے دیانت دار کارکن فراہم کرکے اس کی بنیادیں زیادہ مضبوط کرنے کے لئے کیا تھا۔

بھائی میرے! عملی پسپائی آدمی کو کہاں کہاں ذہنی پسپائی پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ آج تم فرد کی اصلاح کے کسی ایسے طریقے کی تلاش میں ہو جو اسلامی بھی ہو اور نظام باطل اس سے ناراض بھی نہ ہو۔ سوچنے کا یہ ڈھنگ سخت بے چارگی کا آئینہ دار ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ ایسا کوئی اسلامی طریقہ ایجاد نہیں ہوا جس پر باطل ناراض نہ ہو اور اگر کوئی ہے تو

وہ ایجاد بندہ کی قسم کا ہوگا۔ قرآن و سنت کے اسلام سے اسے کوئی قریبی تعلق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اسلام تو اپنے وجود کے اندر ہی اپنی سلطنت کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ اس کے احکام نافذ ہوں۔ منظم فوجوں کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ باطل کے خلاف اس کا حکم جہاد پورا کیا جائے پولیس کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کی تادیب کی جائے عدالتوں کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ اس کے قوانین کے مطابق مجرموں کو سزائیں دی جائیں اور اس کے الہٰی قوانین کے مطابق فیصلے ہوں۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مشرک ظالم اور فاسق ہے۔ اب بتاؤ ایسا اسلام کہاں سے لاؤ گے جو ایسا فرد تیار کرے جس پر نظام باطل بھی پورا اعتماد کرے اور اس کی خدمات سے خوش اور مطمئن بھی ہو۔ نظام باطل تو سرکلر بھیج بھیج کر ایسے لوگوں کو اپنی ملازمتوں سے چن چن کر الگ کر دے گا اور کبھی گوارا نہ کرے گا کہ اسلامی تربیت پائے ہوئے لوگوں پیٹ بھر کھانا بھی کھا سکیں۔ تم جو طبیعت کی بے چینی کا تذکرہ کرتے ہو تو دراصل یہ بے چینی راہِ مستقیم پر ڈگمگانے کا نتیجہ ہے۔ تمہیں شاید اسلام کا انقلابی ہمہ گیر تصور چھوڑ کر کسی عافیت کے گوشے کی تلاش ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ نظام باطل کی عملداری میں مومن کے لئے کسی جگہ کوئی عافیت کا گوشہ نہیں پایا جاتا ہے جب تک وہ غلبۂ اسلام کے تصور ہی سے دست بردار نہ ہو جائے۔ دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر میں اس کا کلمہ بلند کرنے کی جدوجہد میں اور اس کے دین کے نفاذ کے لئے سختیاں سہنے کے عزم میں ہی پایا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھو کہ دل کا اطمینان اور کسی جگہ بھی نہ ملے گا۔ دل کا اطمینان ابنِ زیاد کو نہیں امام حسینؓ کو حاصل تھا۔ مامون کو نہیں امام احمد بن حنبلؒ کو حاصل تھا۔ جہانگیر کو نہیں مجدد الف ثانیؒ کو حاصل تھا۔ فاروق کو نہیں حسن البنا شہیدؒ کو حاصل تھا۔ یہ بات مجھ سے نہ پوچھو۔ ملتِ مسلمہ کی اپنی تاریخ سے

پوچھ لو اور دل کے اطمینان کی تلاش میں ان کوچوں کا مرکز، جاہ چمک دمک تو بہت ہے۔ دنیوی مال و متاع بھی بہت ہے لیکن اگر کوئی شے نہیں پائی جاتی تو وہ یہی دل کا اطمینان ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حقیقی قلبی اطمینان عطا فرمائے۔

(ساتھی کے نام)

۱۹۶۶ء

فسانۂ درد و غم

محبتِ عزیز!

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

آج کی ڈاک میں غم و اندوہ کا ایک طوفان لپٹا ہوا جیل کے اندر آ گیا ہے۔ میرا محبوب چھوٹا بھائی سید مختار احمد انتقال کر گیا ہے۔ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر ہمیں جانا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے برحق صداقت ہے۔ اٹل سچائی ہے لیکن جب کبھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو بڑی تلخ اور جانگسل بن کر آتی ہے۔ آج میرے لئے جیل کی پہاڑ دیواری اور بلند تر ہو گئی ہے۔ یہ کمرہ اور گھٹ کر تنگ ہو گیا ہے۔ یہ کچھوے کی طرح بھاری تالہ اور بوجھل ہو گیا ہے۔ یہ جیل کی تنہائی، خاموشی گھٹن اور حبس اور بڑھ گئے

ہیں اور ابتلائے زنداں کی سوزنا کی تیز تر ہو گئی ہے۔ تم کیا جانو کہ پنجرے میں پنچھی جب پھڑ پھڑاتا ہے تو وسیع ترین فضائے آسمانی کے مقابلے میں اتنی تنگ تیلیوں والے قفس میں اس کی جان کتنی کچھ گھٹ رہی ہوتی ہے اور آزادی یک جنبشِ پر اس کے لئے کتنی قیمتی ہو جاتی ہے۔ اسے بادلوں پر رشک آتا ہے جو فصلِ بہاراں کی طرح آسمان کی پہنایئوں میں آزاد تیرتے پھرتے ہیں۔ اسے ہوا کے جھونکوں پر رشک آتا ہے جو سنسناتے ہوئے آزادی کیسے فراٹے بھرتے گزر جاتے ہیں۔ وہ تو اس خشک پتے پر بھی رشک کرتا ہے جو خزاں دیدہ ہونے کے باوجود ہوا کے دوش پر جدھر چاہے اڑتا پھرتا ہے۔ آہ آج یہ زنداں اپنی ساری ہولناکیوں کے ساتھ کتنا خوفناک اور تنگ ہو گیا ہے۔

میرے ساتھی میرے اندوہ کا اندازہ کر کے مجھے تسلّی تشفّی دے رہے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ میری آنکھ سے ان کے سامنے ایک بھی آنسو نہیں ٹپکا۔ نہ چھلکا۔ نہ پیمانۂ چشم ڈبڈبایا لیکن ایک مدت سے میری طبیعت نے ایک رخ اختیار کیا ہوا ہے اور وہ اخفائے درد و غم کا رخ ہے۔ آنسو اندر دل کی طرف ٹپکیں گے۔ سسکیاں سینے کے اتار چڑھاؤ میں کلبلی مچائیں گی۔ ہونٹ کانپیں گے۔ دل ڈوبے گا لیکن خشک آنکھیں پر سکون چہرہ لرزاں لیکن مطمئن آواز درد و غم کو اپنی اوٹ میں لئے رہے گی۔ مالک کا فضل ہے کہ میں نے غم کو کبھی اپنے اوپر غالب چھاپہ نہیں مارنے دیا اور جب سے تحریکِ اسلامی نے اپنے اثرات ڈالے ہیں طبیعت کا بس یہی رخ متعین ہو گیا ہے۔

مجھے رہ رہ کر مختار مرحوم یاد آ رہا ہے۔ اسے مرحوم لکھتا ہوں تو قلم رکتا ہے۔ جسے جیتا جاگتا چھوڑ آیا تھا۔ وہ آج خاموش کنجِ قبر میں پڑا ہے۔ والدِ محترم کا کیا حال ہو گا۔ اس کی نوجوان بیوی کے لئے زندگی کتنی طویل۔ بوجھل اور ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو گی۔ مالک

ہی ہے جو سب کے لئے زندگی کی راہیں تنگ اور کشادہ ، دشوار اور آسان پرصعوبت اور پر آسائش کرتا چلا جاتا ہے اس کے کارخانۂ اختیار میں کس کی مجال ہے کہ دم مارے کس کی ہستی ہے کہ انگشت نمائی کرے۔ کس کا منہ ہے کہ اونچا بول بول سکے۔ ساری امیدیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسی کے دامن سے وابستہ ہوتی ہیں۔ سارے دل شکستہ ہو ہو کر اسی کے آستانہ پر قرار پکڑتے ہیں اور سارے جذبات مجروح ہو ہو کر اسی درگاہ میں مرہم سکون پاتے ہیں۔

اس خط نے ستر میل کا سفر گیارہ دن میں طے کیا ہے۔ چند دن پہلے سنا تھا کہ کوئی تار بھی آیا تھا جو سنسر کے پاس چلا گیا اور پھر وہاں سے پلٹ کر نہیں آیا۔ یہ خط ڈاک کی لاپرواہی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے جیسے ارباب اختیار کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ میرا عزیز بھائی فوت ہو گیا۔ میرا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ میرے والد کے بڑھاپے کا ایک سہارا نہ رہا۔ ایک معصوم اور بے گناہ نوجوان عورت کا جوان شوہر نہ رہا۔ ننھے آصف کا باپ نہ رہا اور ارباب اختیار کے نزدیک یہ کوئی خبر ہی نہیں ہے جسے ایک تنفلر بند تک بر وقت پہنچا دیا جائے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ان کے سینوں میں دلوں کی بجائے بھیڑیوں اور چیتوں کے خونخوار کلیجے ہیں۔ مجھے رہ رہ کر والد محترم یاد آتے ہیں ان کا دل گردہ ہے جن کے دو بیٹے اس وقت ظالموں کے شکنجے میں کسے ہوئے جیلوں میں پڑے ہیں اور تیسرا بیٹا ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے کر رخصت ہو گیا ہے۔ سنا ہے کہ انھوں نے صبر کر لیا ہے اور پوری طرح راضی برضا ہیں۔ اس نظام باطل نے کتنی ہی ماؤں کی آنکھوں کے چراغ بجھا دیئے ہیں۔ کتنے ہی بالوں کے لاڈلے چھین لئے ہیں۔ کتنے ہی بھائیوں کے بازو توڑ دیئے ہیں۔ کتنی ہی بیویوں کے سہاگ لوٹ

لیتے ہیں۔ یہ نظام ظلم وستم اور خونخواری و خونریزی کا خوفناک دیو ہے جسے قتل کئے بغیر انسانیت کبھی سکون کا سانس نہ لے سکے گی۔ ملت کے نوجوان جب تک اس دیو سے پنجہ کشی کر کے اپنی جوانیوں کا تازہ خون اسے زیر کرنے پر صرف نہ کریں گے دین و اخلاق آزادی و حریت کی راہ ہموار نہ ہو گی۔ مختار تو سرخرو ہو کر اپنے مالک سے جا ملا اور دیر یا سویر ہمیں بھی اسی راستے پر جانا ہے لیکن باطل کے خلاف چھیڑی ہوئی یہ جنگ نتیجہ خیز ہوئے بغیر کبھی ختم نہ ہو گی یہ جاری رہے گی۔ ہم حق کے مجاہد میدان میں لاتے رہیں گے اور باطل سے کشمکش اور پنجہ کشی جاری رکھیں گے۔ ہمارے خون کے ایک ایک قطرے سے نظام باطل کے خلاف لشکر ابھریں گے اور ہماری قبروں سے باطل کے خلاف للکار بلند ہوں گی۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ جنگ ایک دن یا چار دن کا معاملہ ہے یا ایک زندگی یا ایک نسل کا قصہ ہے۔ یہ قصہ نسلِ آدم اور نسلِ ابلیس کی پوری داستان پر مشتمل ہے جس کا ایک سرا ہبوطِ آدم سے ملا ہوا ہے اور دوسرا قیامت کا دامن تھامے ہوئے ہے۔

عزیزم آج دل کے داخلی اتھاہ قلزم میں بڑے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ اور دماغ کے گوشۂ تنہائی میں آندھیاں چل رہی ہیں۔ میں ان طوفانوں اور آندھیوں کے درمیان کھویا کھویا زنداں کی چہار دیواری کے اندر ڈولتا پھر رہا ہوں۔ خاموشی اور سناٹا تو بہت ہے لیکن آج چین وسکون کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔ ان طوفانوں کو دل و دماغ میں تھامے سکونِ دل کی تلاش میں پھانسی احاطے کی دیوار کے سائے میں ادھر اُدھر ٹہل رہا ہوں۔ ۔ے

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود
دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

دانا قلعہ سخنجاں ۴ مئی ۱۹۶۶ء

چاند کا سلام

یہ چاند ہمیں مدت سے دیکھتا آیا تھا کہ ہم نے کفر اور جاہلیت کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں اور اس کے تصرف میں اپنے آپ کو دے دیا ہے۔ یہ چاند ہر سال آتا رہا اور ہمیں اسی مجبوری، بے بسی اور لاچاری اور کس مپرسی کی حالت میں دیکھتا رہا۔ ہر سال وہ قدرت کی طرف سے تازہ روشنی کے تحفے لے کر آتا رہا اور ہر سال ہم بے چارگی کا باسی سلام اس کے سامنے پیش کر دیتے رہے۔ ہر سال اس نے نئی امیدوں اور نئے حوصلوں سے افق کے پاس سے ہماری طرف جھانک کر عید کا سلام ہمیں دیا اور ہر سال ہم نے یہ کہہ کر اسے مایوس کر دیا کہ "تیرے اللہ کے بندے مایوس و مجبور ہیں اور ان کے پاس کوئی ایسی سرزمین نہیں جہاں وہ اپنے رب کا دین قائم کر سکیں"۔ ہر سال وہ امید بھری نظروں سے تکتا ہوا آیا اور ہر سال مایوس اور زرد چہرہ لئے ہوئے وہ لوٹ گیا

ہم مدتوں، اس سے خاموش وعدے کرتے رہے اور وہ مدتوں ہم سے خاموش تقاضے کرتا رہا۔

لیکن اب وہ ہمیں بے بس و مجبور دیکھنے نہیں آتا۔ ہم نے وہ بندِ غلامی توڑ ڈالے ہیں۔ جو ہمیں اپنے رب سے کئے ہوئے وعدوں سے فرار کی راہیں دکھایا کرتے تھے ہم کہا کرتے تھے۔ "آہ وہ خطۂ زمین کہاں ہے جس میں ہم اکثریت کے خوف سے بے خوف ہو کر اور جابر فرنگی کے جبر سے آزاد ہو کر اللہ کے دین کو سربلند کریں؛ اللہ کا دین اور رسولؐ کا پاکیزہ اسوہ ہماری ہزار ہمت افزائیاں کرتا تھا لیکن ہم کسی نئے خطۂ زمین کی آرزو میں صرف افق پر نظریں جمائے رکھنے کے ہی عادی ہو گئے تھے۔ ایک محبوب خطۂ زمین جہاں خدا کا قانون اپنی تمام برکتوں کے ساتھ انسانوں پر نافذ ہو۔ جہاں مسلمانوں کی زندگی کا سارا اثاثہ رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ جہاں امن اور سلامتی ہو۔ جہاں عدل اور انصاف ہو۔ جہاں صداقت اور وعدہ وفائی ہو۔ جہاں رحمدلی اور خدا ترسی ہو۔ جہاں یتیم بے یار و مددگار نہ ہوں۔ جہاں بیوہ کو بھوک اور بے آبروئی کا اندیشہ نہ ہو، جہاں ضعیف کو حکومت کی لاٹھی کا سہارا ہو۔ جہاں طہارتِ نفس کی خوشگوار بادِ بہاری چلے۔ جہاں خوش خلقی اور خدا خوفی کی خوشبوؤں سے فضائیں مہکی رہیں۔ جہاں پاسِ عہد، اور احترامِ انسانیت سے دھوپ میں خنکی ہو۔ جہاں رحم اور باہمی ہمدردی کی گرمجوشی ہو، جہاں کمزوروں میں سورج کا سا وقار ہو۔ اور طاقتوروں میں چاند کی سی شفقت ہو۔ دُور افق کے پار مسلمانوں نے ان خوابوں کو دیکھا تھا۔ ایک ایسا خطۂ زمین جو پاک ہو اور جس کی فضاؤں میں صرف لاالٰہ کی گونج ہو، متحد ہو کر یک زبان ہو کر سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر، اگر دو پیش سے بے پرواہ ہو کر آغاز و انجام سے بلند ہو کر اور ابتدا و انتہا سے بے خبر ہو کر سب نے چاہا تھا اور آہ کہ یہ چاہنے کے لئے انہیں بہت سے چاہنے والوں کو خاک و خون

میں تڑپتا دیکھنا پڑا تھا، وہ جن کی ہر راحت انہیں عزیز تھی۔ ان کی لاشوں پر سے انہیں گزرنا پڑا وہ جن کی رفاقت انہیں محبوب تھی۔ انہیں موت کے ہمراہ رخصت کرنا پڑا۔ وہ جن کی باتیں انہیں بے حد محبوب تھیں۔ انہیں موت کی بھیانک خاموشیوں پر اپنے ہاتھوں دھکیلنا پڑا۔ اور پھر انہوں نے وہ خطۂ امید پالیا جس کی تمنائیں اور جس کے لیئے دعائیں ان کا شب و روز کا مشغلہ بن گیا تھا۔ جس کے لیئے وہ اپنے بڑے بڑے محبوبوں سے دست و گریبان ہوئے تھے۔ جس کے لیئے انہوں نے اپنے بڑے بڑے معززوں کی پگڑیاں اچھال دی تھیں۔ جس کے لیئے انہوں نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ کیا کچھ نہ دیا تھا۔

آج وہ اسی پر تمنا خطے میں ہیں جس کا مطلب وہ لا الٰہ بتایا کرتے تھے۔ اور یہ چاند اب انہیں ان کے نئے گھر میں دیکھنے آتا ہے۔ یہ چاند اب انہیں ان کے امیدوں کے محل میں مبارکباد کہنے کے لیئے آتا ہے اور ساتھ ہی ان وعدوں کی فہرست بھی ہمراہ لاتا ہے۔ جو انہوں نے اپنے رب سے بار بار کیئے اور انہیں زمانے کے سینے پر کندہ کر دیا تھا جو انہوں نے وقت کی لوح پر اپنی اجتماعی آواز کے قلم سے لکھ دیئے تھے۔ یہ چاند انہیں وعدوں کی فہرست لیکر ان مسلمانوں کے پاس اب بھی ہر سال آتا رہتا ہے۔

اس سرزمین کا ایک ایک گھر اس پیغام سے آشنا ہے۔ سینے میں دھڑکنے والا ہر دل اس پیغام کی آواز کو اپنی دھڑکنوں میں سمویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس سرزمین پر رہنے والا ہر ذی روح خون کے ان دریاؤں کے رخ دیکھ چکا ہے۔ ان کی لہریں گن چکا ہے۔ ان طوفانوں کی گونج سن چکا ہے۔ ان زلزلوں کی گڑگڑاہٹ محسوس کر چکا ہے۔ ان قیامتوں کی تباہی سے آشنا ہے جو اس پر اس سرزمین کے حصول کے لئے برپا کئے گئے تھے لیکن اس نے اپنے عزم کے فولاد سے ہر دکھ کا منہ موڑ دیا تھا لیکن آج تک وہ اپنے اس خطۂ زمین میں ان خوابوں کی تعبیر سے ناآشنا ہے جو اس نے ان تباہیوں کے اس پار دیکھے تھے۔ جو اس کے افق کے کناروں پر تمناؤں کی

وادیوں میں روشن سایوں کی طرح جھلملاتے ہوئے پائے تھے۔ آخر آج وہ عید کے اس چاند کو کس نئے عذر سے ٹال سکتا ہے؟ کیا اب یہ چاند زمانے کے سینے پر مسلمان کی نامسلمانی کی مہر ثبت کر دے گا؟ کیا اسے اب بھی مایوس ہی لوٹنا ہوگا۔ کیا اسے اس بات پر گواہی دینے پر مجبور کر دیا جائے گا کہ مسلمان اپنے رب سے باغی ہو چکا اور اس نے لا الٰہ کی سرزمین میں نئے لات و ہبل تراش لئے ہیں؟ آہ یہ تصوّر کتنا دلخراش ہے کہ اس تصور سے ہی زندگی کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔

یہ چاند عید کا یہ آبدار خنجر تو انہیں سپاہیوں کو مبارک باد دیتا ہے جو یہ عزم رکھتے ہیں کہ وہ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر مسلمان کے خون سے خریدا گیا تھا اور بہت گراں خریدا گیا تھا۔ اسلام کا اقتدار قائم کریں گے۔ یہ خنجر تو انہیں کی پیٹیوں میں زیب دیتا ہے جو کفر کو کلیتہً ختم کرنے کے لئے ہتھیار بند ہو گئے ہوں۔ جنہوں نے عزم کر لیا ہو کہ جیسے انہوں نے باہر کے بوجہلوں اور بولہبوں سے نجات حاصل کی تھی۔ ویسے ہی گھر کے منافقوں اور مفسدوں سے بھی نجات حاصل کریں گے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ اس چاند کو مایوس نہ ہونے دیں۔

عید کا یہ چاند دیکھتا ہے کہ یہ ملک بھی غیر منقسم غیر مسلم ملک کی طرح ویسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ عریانی و مےخواری وافلاس کے نظارے ویسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر یہاں بھی عام ہیں۔ اسلام ویسے ہی یہاں بھی مجبور و بیدخل و بے وقار ہے۔ ظلم و جور اور کفر ویسے ہی یہاں بھی برسر اقتدار ہے۔ یہ حیران ہو ہو کر جھک جھک کر دیکھتا ہے کہ کیا یہ وہی خطہ ہے جسے دیکھنے کے شوق میں وہ وارفتہ ہو ہو گیا تھا جس کے متعلق اس نے اپنے ہم نشینوں سے بہت بہت سرگوشیاں کی تھیں اور جس کا چرچا اس نے بزم انجم میں جا بجا کر رکھا تھا اور جسے اس نے خطۂ رحمت کا نام دینے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ کیا یہ وہی ملک ہے جو اس

کے لئے تو اسے پہچاننا بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔

وہ جھک جھک کر دیکھتا ہے۔ لیکن اس جستجو کا کوئی نشانِ امید اسے یہاں موجود نظر نہیں آتا۔ اس کی تلاش کا یہاں کوئی حریف نہیں ہے۔ اس کی سرگوشیوں کا کوئی جواب دینے والا نہیں۔ اس کے سلام بے جواب واپس چلے جاتے ہیں۔ اس ملک میں کتنے ہیں جو اس کے خاموش سلاموں کا مفہوم سمجھتے ہوں اور کتنے ہیں جو اس کے سلام کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ کتنے ہیں جو اس خدا کا قانون اس ملک میں جاری کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ جس کی وہ ایک نشانی ہے۔ کتنے ہیں جنہوں نے اس کشتی میں قدم رکھ دیا ہے۔ جو عزم و استقلال کے بادبانوں سے ہر اس طوفان کو نیچا دکھانے کا حوصلہ رکھتی ہے جو راہِ حق میں رکاوٹ بننے کیلئے سامنے آئے۔

یہ چاند جھک جھک کر انہیں سلام کہہ رہا ہے۔ جنہوں نے خدا کی راہ میں قدم اٹھایا ہے۔ جنہوں نے خدا کی رضا کے سامنے اپنی سپر ڈال دی ہے۔ جنہوں نے طاغوتِ وقت سے لڑ جانے کے لئے کمریں کس لی ہیں۔ جنہوں نے ہر فرعون اور ہر نمرود سے کہہ دیا ہے کہ حق آ رہا ہے اور باطل جا رہا ہے اور باطل جانے ہی کی چیز ہے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ زمین ایسے مجاہدوں سے خالی نہیں ہے، مسرت سے اس کا چہرہ چمک اٹھا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے جو اپنا سب کچھ لٹا دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ وہی ہیں جو اس کے سلام کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہیں عید کا یہ چاند ایسے ہر مجاہد کو سلام کہتا ہے۔

(نگار ۱۹۵۰ء)

بیچاری کتابیں

(روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ)

ایک آدمی جسے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے، جمع کرنے، سنبھالنے اور محفوظ رکھنے کا شوق ہو اسے بالعموم ایسے احباب سے واسطہ پڑتا ہے جو کتابوں کو ان کے مالک کی حفاظت سے نکال لے جاتے ہیں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ یہ مصیبت کسی ایک آدمی کی مصیبت نہیں ہے اور نہ یہ مصیبت لاتے والا کوئی ایک آدمی ہوتا ہے بلکہ یہ کتابیں لے جانے، اڑا لینے، ضبط کر لینے، گم کر دینے اور پھاڑ کر واپس کرنے والوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہے۔ جو ہماری سوسائٹی میں پڑھے لکھے معززین کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ ان کی پہچان مشکل ہے۔ صرف تجربہ بتاتا ہے کہ کون کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے اس طبقہ کے ہر فرد سے گلہ ہے۔ جیسے ہر اس آدمی کو گلہ ہوتا ہے جو کتابیں جمع کرنے کا ذوق رکھتا ہو۔

اس لیئے میرا روئے سخن کسی شخص کی طرف بھی نہیں ہے۔ جن صاحب کو شبہ ہو کہ میری

کوئی بات ان کی ذاتِ گرامی پر کسی پہلو سے چسپاں ہوتی ہے وہ اسے میری گستاخی نہ قرار دیں۔ بلکہ میری ان باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے وطیرے پر قائم رہیں۔ البتہ یہ تو ہرگز نہ کریں کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مخاطب قرار دے کر مجھ سے ناراض ہو بیٹھیں۔ مجھ میں یہ کمزوری بہرحال موجود ہے۔ کہ میں کتابوں کے ساتھ احباب کو بھی ضائع کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اور یہ کمزوری ہر اس شخص میں ہوتی ہے جو میری پوزیشن میں ہو۔

کتابیں لے جانے والوں میں رنگ برنگ کے حضرات ہوتے ہیں اگرچہ کتابوں کو اغوا کر لے جانے کی صفت سب میں مشترک ہے۔ لیکن اس اشتراکِ طبعی کے باوجود ان کی بے شمار اقسام ہیں۔ ان میں سے چند ایک سے میں آپ کا تعارف کرائے دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور جب آپ کوئی نئی کتاب لائیں۔ اور اسے ضائع کرنا بھی مقصود نہ ہو تو ایسی ضرورت کے موقع پر یہ معلومات آپ کے کام آئیں۔

تعارف سے پہلے ایک بنیادی بات جو کتابیں مانگ لے جانے والوں کے دل و دماغ میں ثبت ہو چکی ہے اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ اخلاقی پابندیوں اور دیانت کے تقاضوں کے مستند بھروسے پر اپنی ساری لائبریری نہ لٹا بیٹھیں۔ بنیادی بات جو آج کل کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے اندر ایک ثابت شدہ، قبول کردہ اور معروف حقیقت بن چکی ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب کی امانت کوئی امانت نہیں ہے جسے واپس کیا جائے۔ کتاب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لین دین میں دیانت کے اس معیار کو سامنے رکھا جائے۔ جس کا روزمرہ کے دیگر مسائل میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایک نہایت دیانت دار آدمی جو کسی سے ایک آنہ لے کر کبھی نہیں بھولتا اور ایک عرصہ کے بعد بھی نہایت ذمہ داری سے بھول جانے کی انتہائی معذرت اور خدا ترسی کے شدید احساس کے ساتھ اسے واپس کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ وہ آپ سے بیس روپے کی کتاب لے کر کبھی بلا

ڈکار ہضم کر جانا عین روزمرہ کی بات سمجھتا ہے جس میں اسے دیانت و امانت کے اصولوں کی پامالی کا دور دور تک احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا۔ کہ اس معاملہ میں دیانت و امانت کا بھی کوئی سوال کھڑا ہوتا ہے۔!

اس تلخ صورتِ حال سے مجھ جیسے لوگوں کو ایک مدت سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ جو کتاب پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی ہیں اور اتفاق سے دینی و اخلاقی کتب، دوسروں کو پڑھانا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ پس اگر کسی کو ہماری اس کمزوری کا پتہ چل جائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ کتاب احسان کا چھدا رکھ کر پڑھنے کے لئے لی جاتی ہے اور پھر کبھی واپس نہیں کی جاتی۔ میرے پاس کئی لمبی لمبی فہرستیں ایسی ہیں جن کے اوپر مغویہ کتب کی ایک طویل قطار درج ہے۔ ان میں اکیس روپے کی ٹائن بی کی تاریخ تہذیب انسانی حصہ اوّل سے لے کر چھ آنے کے پمفلٹ "سلامتی کا راستہ" تک شامل ہیں۔ یہ سب کتابیں جب میرے ہاتھ سے گئیں تو پھر کبھی واپس نہ آئیں۔ جو حضرات ان کتابوں کو لے جاتے ہیں وہ رنگ برنگ کے حضرات ہیں۔ دوست احباب، کالجوں کے طلباء، اسلام کے متعلق مفصل معلومات اور علمیت کا اظہار کرنے کے لئے دوسروں سے کتب لے کر اپنے پاس ڈھیر کرنے کے شائق ہوں وغیرہ۔

ایک صاحب آئیں گے ۔ دیکھوں جناب! ایک صاحب معاشیات پر بحث کرتے ہیں۔ سود کی حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ کہتے ہیں آج کل سود اور بنک کاری کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کوئی کتاب ان کے لئے تجویز کیجئے۔

میرا خیال ہے ان کو "جدید معاشی نظریات اور اسلام" اور "اسلام اور سود" پڑھا دیجیے تو بہت بہتر! اگر آپ کے پاس یہ کتب ہوں تو دے دیجئے۔ میں پھر کبھی لاہور گیا تو خرید لاؤں گا۔"

مجھے بھی شوق ہے کہ جن لوگوں کے نظریات اسلامی تعلیم کے بارے میں الجھے ہوئے ہوں ان کی الجھنیں دور ہو جائیں۔ میں فوراً اٹھ کر اپنی لائبریری سے "جدید معاشی نظریات" جو پچھلے ہفتہ میں منگائی ہے۔ اور "اسلام اور سود" دونوں کتابیں ان کے حوالے کر دوں گا۔

چند دنوں تک کتب ذہن میں رہیں گی۔ پھر کسی کاغذ کے پرزے یا ڈائری پر کہیں نوٹ کر لی جائیں گی۔ چند ہفتوں کے بعد تذکرۃً شرماتے لجاتے ان سے کسی ملاقات پر گول مول طریقہ سے کتابوں کا پوچھوں گا تو جواب ملے گا۔

"جی کیا کہوں۔ وہ صاحب پلٹ کر میری دکان پر آئے ہی نہیں۔ شاید شہر سے باہر کہیں چلے گئے ہیں۔"

چلیئے قصہ ختم ہوا اور دونوں کتابیں ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ چاہے وہ اپنے تبلیغی مشن پر موجود رہیں یا کسی ردی کی دکان پر بک جائیں۔!

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی صاحبزادے کالج کی کسی مجلسِ مباحثہ کے لئے کسی موضوع پر نکات چاہتے ہیں۔ ان کو موضوع کی نسبت سے کتاب تجویز کر دی۔ وہ دوسرے دن کی شام کو کتاب کی واپسی کا وعدہ کر کے لے گئے اور پھر وہ کتاب کبھی واپس نہ آئی۔ اگرچہ صاحبزادے پھر بھی بار بار آتے رہے کہ دوسری کتب پر ہاتھ صاف کریں۔

بعض ایسے دوست ہوتے ہیں جو بے تکلف احباب کہلاتے ہیں۔ آئے، الماری کا پٹ کھولا۔ جلدوں پر سرسری نظر ڈالی۔ جس کتاب کی جلد موٹی اور خوبصورت معلوم ہوئی اسے پوری بے دردی سے گھسیٹا۔ بغل میں دابا۔ "بھئی ذرا دیکھنے کو لئے جا رہا ہوں۔" اور بے تکلفی سے لے گئے اور بے تکلفی سے ہی واپس نہ کی۔ کبھی تقاضا کیا تو ابھی فارغ نہ ہونے کا بہانہ کیا۔ مزید تقاضا کیا تو بات ہنسی مذاق میں ٹال دی۔ مزید کچھ کہا تو طنز و تعریض کے چند تیر

برسا دیئے۔ اس پر بھی کبھی کتاب پر اپنا حق ظاہر کیا۔ تو معمولی سی خفگی کا اظہار کر دیا۔ اور جھٹ تعلقات کی ترازو کھڑی کر کے ایک طرف کتاب کو رکھ دیا اور دوسری طرف خود کھڑے ہو گئے ہیں ایک بامروت آدمی کس طرح کتاب کا وزن قرار دے سکتا ہے۔ جو کتاب اس آزمائش پر چڑھ گئی اور اس ترازو میں تل گئی وہ پھر کبھی نہیں لوٹتی وہ گویا تعلق کے مقابلہ میں ہدیتہً از خود قبول کرلی جاتی ہے۔

بعض حضرات ہیں جو اسی نیک نیتی سے آپ کی کتاب کو آگے چلا دیتے ہیں جس نیت سے آپ نے ان کو دی تھی۔ آپ نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ انہوں نے ایک ملحد کو دے رکھی ہے اور فخر سے گویا آپ کا فریضہ ادا کر کے آپ پر احسان کر رہے ہیں۔ پھر کبھی پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ ان صاحب نے اپنی ایک عزیزہ کو دی ہے۔ جن کا فلسفہ پڑھنے کے سبب خدا سے یقین اٹھتا چلا جارہا ہے اور انہوں نے آگے اپنی ایک سہیلی کو دے دی ہے جو ہیڈ مسٹرس ہیں اور خیال ہے کہ اگر ہیڈ مسٹرس متاثر ہوگئیں تو وہ ایسی دینی کتب اپنے اسکول کی لائبریری میں منگا کر رکھیں گی جس سے آئندہ نسل کی اصلاح کا کام ہوگا۔ آپ کی ہی ہوئی کتاب چونکہ آئندہ نسل کی اصلاح کے کام کی راہ ہموار کر رہی ہے۔ اس لئے اس کا اس سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس کو ایسے اہم کام سے ہٹا کر واپس لائبریری میں لا رکھنا کوئی مفید کام ہے اس لئے اس کتاب پر بھی صبر کیجئے اور خوش ہو جائیے کہ وہ اپنا کام کہیں نہ کہیں ضرور کر رہی ہے۔

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو کتاب لے جائیں گے۔ مگر پڑھیں گے کبھی نہیں۔ صرف کتابیں لے جانا۔ ہاتھ میں لے کر چلنا، دوسروں کو دکھانا۔ یہی ان کا خاص کام ہوتا ہے۔ ایسے لوگ عموماً بے پڑھے ہی کتابیں واپس کر دیتے ہیں۔ اس قسم میں کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کو لائبریری بنانے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن خریدنے کی بجائے دوسروں سے کتب لے جا لے جا کر وہ اپنی لائبریری بناتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر بے پڑھے محفوظ رکھتے ہیں۔

ان کی لائبریری کھولئے تو اس میں سے بہت کچھ لوٹ کا مال نکلے گا۔ شاید آپ کی مدّت سے کھوئی ہوئی بعض کتب بھی مل جائیں۔

خراب قسموں میں ایک سب سے عجیب قسم وہ ہے جو کتاب کے ساتھ کشتی لڑتے ہیں۔ واپس کریں گے تو اتنی گندی ہو گی، جیسے اتنے دن پڑھنے کے بعد چولھے میں ہی رکھتے رہے ہیں۔ اوراق کے سرے مڑے ہوئے ہونگے۔ گرد پوش پھٹ گیا ہوگا تو پھینک دیا ہوگا اور واپس کرتے ہوئے سادگی سے کہہ دیں گے "اوپر کا کاغذ ذرا گندہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اتار کر پھینک دیا ہے" کبھی کتاب واپس کریں گے تو اس پر سالن کے داغ دھبے ہوں گے۔ چائے کی پیالی کے پیندے کا گول نشان ہوگا۔ تیل والی انگلیوں کے نشان ہوں گے اور کوئی ایک آدھ ورق پھٹا ہوا بھی ہوگا۔

ایسے بھی ہوتے ہیں جو کتاب واپس کرتے ہیں تو کتاب کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔ نہ اس کا ابتدائی حصّہ ہوتا ہے۔ اور نہ آخری ورق باقی ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سپاہی معرکے سے اس حالت میں واپس آیا ہے کہ اس کا عضو عضو زخمی ہے۔ ان حضرات میں سے چند ایک ایسے ملے جنہوں نے کتاب واپس کرتے ہوئے کتاب کی خوب تعریف کی تو مجھے شبہ ہوا کہ انہیں کتاب اتنی پسند آگئی ہے کہ وہ اسے پڑھنے کی بجائے غالباً کھاتے رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو ایسی کتب واپس کر دیں تاکہ وہ ان کو اچھی طرح ہضم کر سکیں۔ ایک صاحب جب ایک بار میرا ذاتی مطالعہ کا قرآن مجید جس پر میں نے جا بجا حاشئے لکھے ہوئے تھے۔ ایک دن کے وعدے پر لے جا کر چھ ماہ بعد بسیار تقاضوں پر واپس کرنے آئے تو میں اسے پہچان تک نہ سکا۔ پھر ان کے بتانے اور بار بار اُلٹ پھیر کے بعد میں نے بعض نشانات سے شناخت کیا۔ تو میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بھائی صاحب یہ بتائیے کہ آپ اسے الماری میں رکھتے ہیں۔ یا باورچی خانے

میں تو انہوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور میری بات نہ سمجھ سکے۔

ایک مطالعہ کی کتاب کی زیادہ سے زیادہ عمر بیس پچیس "مطالعہ" ہوتی ہے۔ جب اتنے ہاتھوں سے وہ کتاب گزر جائے تو پھر گویا وہ ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ عمر بھی اس صورت میں ہوتی ہے جب اسے احتیاط سے پڑھا جا رہا ہو۔ لیکن یوں مانگے پر دی گئی کتب کی عمر گھٹ کر "چند مطالعے" رہ جاتی ہے اور جو کتاب ایک بار "مطلعے" پر چڑھ جائے۔ پھر وہ بہت جلد دم توڑ دیتی ہے۔ جس طرح محاذ جنگ پر گئے ہوئے سپاہی کی زندگی کی گارنٹی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی کتب بار بار خرید کر لائبریری میں رکھنی پڑتی ہیں۔

بعض کو دوسروں کی کتابوں کے حاشیوں پر اپنے نوٹ لکھنے کی دلچسپ عادت ہوتی ہے۔ وہ جو پسند آتا ہے اسے نشان زد کر دیتے ہیں۔ حاشیے پر اس کی تعریف یا مصنف کی تعریف میں مزید جملے لکھتے ہیں اور وہ عجیب وغریب جملے ہوتے ہیں "بھئی! واہ کمال کر دیا"۔ "کیا دندان شکن جواب ہے"۔ "اسے کہتے ہیں استدلال"۔ "بے شک"۔ "دریں چہ شک" "اب کہو کیا کہتے ہو"۔ "یہ کتاب لاجواب ہے"۔

بعض حضرات کتاب پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں۔ اپنی یادداشت کے لئے دوسرے احباب کے پتے نوٹ کر لیتے ہیں۔ اپنے بچوں کے نام لکھ دیتے ہیں۔ طبی نسخے لکھ لیتے ہیں اپنے خطوط ان میں رکھ دیتے ہیں۔ بعض کتب پر ان کے بچوں نے خوش خطی کے عجیب وغریب نمونے جلی قلم سے دکھائے ہوتے ہیں

بعض لوگ کتب لیتے ہوئے خود کتاب پڑھنے کی نیت سے نہیں لیتے۔ بلکہ محض کتاب لے جانے کی نیت سے لے لیتے ہیں۔ ان کا ارادہ پڑھنے کا ہوتا ہی نہیں۔

میری لائبریری کے خانوں میں کتنے ہی مقامات خالی پڑے ہیں۔ کتب کے دائیں

بائیں جگہیں خالی ہیں، جو کسی نئی ترتیب کے موقع پر یا کسی نئی کتاب کے آجانے کے بعد پر ہو جائیں گی۔ یہ خالی جگہیں ان کتب کی ہیں جو میرے مطالعہ پسند احباب لے گئے۔ ان میں سے بعض کے نام مجھے یاد ہیں۔ بعض ذہن سے نکل چکی ہیں۔ بعض ڈائری میں کہیں نہ کہیں محض درج ہیں اور وہ بھی اس لئے درج ہیں کہ جب سال بھر بعد میں کتب کا جائزہ لوں تو وہ گمشدہ کتب کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔ اس وقت میرے پاس "رحمۃ للعالمینؐ" کی پہلی اور تیسری جلد موجود ہیں۔ ان کے درمیان خالی جگہ سے دوسری جلد غائب ہے۔ یہ جو صاحب لے گئے ہیں ان کا اتا پتا بھی بھول چکا ہوں۔ "الجہاد فی الاسلام" غائب ہے۔ چھ ماہ پہلے ایک صاحب کسی کو دکھانے کے لئے تین دن کے وعدے پر لے گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی "سیرت النبیؐ" کا چھٹا حصہ جو اخلاق پر مبنی ہے، غائب ہے۔ باقی ۵ جلدیں اس کا خلا سے مفارقت پہلو میں لئے پڑی ہیں۔ "معارف الحدیث" کی پہلی جلد نہیں ہے۔ ایک دوست رمضان شریف میں مطالعہ کے لئے لے گئے تھے۔ اب بقر عید بھی گزر گئی ہے۔ "ترجمان السنۃ" کی تیسری جلد غائب ہے جو صاحب لے گئے تھے۔ ان کا تبادلہ ضلع سے باہر ہو گیا ہے۔ "تفہیم القرآن" کی پہلی جلد ایک طالب علم سورۂ مائدہ کی تیاری کے سلسلہ میں لے گئے تھے۔ طالب علم صاحب نے امتحان پاس کر لیا ہے لیکن میری کتاب غالباً انہوں نے اپنے انعام کے طور پر رکھ لی ہے۔ علامہ محمد اسد کی شاہراہ مکہ (Road to Mecca) لے کر کوئی صاحب ایسے گئے کہ شاید کتاب کے دیئے ہوئے نقشے کے مطابق مکہ شریف کا مبارک سفر پیدل ہی اختیار کر لیا ہے۔ ایک صاحب میری ایک ضخیم طبی کتاب لے گئے۔ کئی ماہ ہو گئے ہیں۔ اب میں منتظر ہوں کہ سن لوں کہ انہوں نے کسی شہر میں اسی کے بل پر کوئی مطب قائم کر لیا ہے۔ ایک صاحب "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر لے گئے تھے۔ مدت ہو گئی واپس نہیں ہوا۔ سنتا ہوں کہ اس کے لطائف سے اب وہ اپنی

مجالس میں بیان کرتے ہیں۔ جب تک سارے نمبر کے لطائف مجالس میں بیان نہ ہوچکیں۔
اس کی واپسی کی امید عبث ہے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کتاب لے جاتے ہیں۔ تو جاتے ہی اس پر دوسرا کاغذ چڑھا لیتے ہیں۔ اسے کوئی داغ دھبا نہیں لگنے دیتے۔ بہت جلد واپس کرتے ہیں کتاب کو بھی امانت سمجھتے ہیں۔ کتاب اگر خستہ حالت میں ہو تو جلد کرا کر واپس کرتے ہیں۔ گم ہو جائے تو نئی کتاب بازار سے خرید کر لاتے ہیں۔ توجہ سے پڑھتے اور اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ شکوک و شبہات رفع کرتے ہیں۔ بعض اوقات کتاب دینے والے کی معلومات میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اس کی پرانی معلومات کو بھی تازہ کرتے ہیں۔ بس ایسے ہی لوگ ہیں جن کو کتاب دینے کو جی چاہتا ہے۔ اور جب وہ کتاب واپس لاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کو دوسری کتاب دی جائے۔ یہی لوگ ہیں جو آگے چل کر ایک مقصدی کام میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں اور بہت سی کتابوں کی قربانی کے بعد ہی میسر آتے ہیں۔!

(انتظار)

۱۹۶۰